افسانوں کا مجموعہ

ڈھانچہ

نام کتاب	ڈھانچہ ۔
نام مصنف	محمود شاہد
مصنف کا پتہ	۱۶۸/۱۲، ایم۔ آر۔ اسٹریٹ، کڑپہ ۔ ۵۱۶۰۰۱ (اے، پی)

تقسیم کار

ڈاکٹر عبدالستار ساحر ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی	لیکچرر شعبۂ اردو، ایس۔ وی۔ یونیورسٹی، تروپتی ۵۱۷۵۰۲
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	پرنسس بلڈنگ، جے۔ جے۔ ہاسپٹل۔ بمبئی ۳۔ اُردو بازار دہلی ۶۔ علی گڑھ
توازن،، سہ ماہی	۴۵۴، نیا پورہ، مالیگاؤں ۔ ۴۲۳۲۰۳
جمیل نظام آبادی	،،گونج،، ہفتہ وار، ۶-۳-۴، عقب پکچر پیلس، نظام آباد، اے پی
سید ہدایت اللہ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ	انجمن ترقی اُردو کڑپہ ۳۸۶/۱۳ صاحبِ مکان، چاند پھر الگنبد، کڑپہ ۵۱۶۰۰۱ ۔ فون: ۲۱۴۹۸

ناشر

ایم۔ ایس۔ پبلی کیشنز	۱۶۸/۱۲، ایم۔ آر۔ اسٹریٹ، کڑپہ ۔ ۵۱۶۰۰۱ ۔ فون: ۲۲۰۹۶
کتابت	محمد شمس الزماں خان بمبئی ۔
طباعت	فخری پرنٹرس، بمبئی ۲۷
سرورق	افتخار حسین سوداگر اینڈ VERONICA BRAGANZA
تزئین	قائم حسین سوداگر و عبدالکریم شیخ رچھاپہ خانہ رفلک ایڈ ورٹائزنگ
اشاعتِ اول	۱۹۹۵ء
قیمت	۶۰ر روپے

انتساب

چھوٹے بھائی
سعید نظر کے نام!

فہرست

نیم کے پیڑ سے برآمد شدہ شہد

ہم دونوں کے درمیان برسوں سے شہد کا رشتہ قائم ہے۔ اس کے باوجود ہم دونوں یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہم جو شہد پی رہے ہیں وہ خالص نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی ایسی شے ملی ہے جو شہد کے ذائقہ کو زائل کر دیتی ہے اور اسے ایک تلخ سیال میں بدل دیتی ہے۔

وہ میرے گھر آتا ہے تو یہ اندیشہ اس کے دامن گیر ہو جاتا ہے کہ کہیں گھر کی چھت اس پر نہ ٹوٹ گرے۔ وہ اکثر میرے گھر آتا

ہے اور میں بھی اُس کے گھر جایا کرتا ہوں۔ میں اُس کی بیوی کی بہت عزت کرتا ہوں۔ وفا پرست، کشادہ دل، شگفتہ رو عورت اور وہ میرے بچوں سے بہت پیار کرتا ہے۔ خصوصاً وہ میرے دوسرے لڑکے کو بہت چاہتا ہے۔ میری بیوی کہتی ہے کہ ہمارا دوسرا لڑکا اُس پر گیا ہے۔ شاید اسی لئے وہ اسے اتنا چاہتا ہے۔ وہ جب بھی میرے گھر آتا ہے بچوں کے لئے ٹافیاں، چاکلیٹ، کھلونے وغیرہ ضرور لاتا ہے اور ایک ایک بچہ کو بُلا کر اپنے ہاتھوں سے ان میں تقسیم کرتا ہے۔ لیکن ---- لیکن ---- میں اسے ایسا کرنے سے باز رکھنا چاہتا ہوں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے بچے ٹافیاں اور چاکلیٹ کھا کر چوہوں کی طرح ڈھیر نہ ہو جائیں۔ تڑپ تڑپ کر دم نہ توڑ دیں ــــ بچے ٹافیاں اور چاکلیٹ لے کر خوشی خوشی کھاتے ہوئے کھیلنے کے لئے باہر چلے جاتے ہیں۔ دوسرا لڑکا جو اس کی شباہت کا ہے اس کی گود میں آبیٹھتا ہے اور اپنی میٹھی سی زبان میں کہنے لگتا ہے ــــ

"انکل! انکل! ایک اور چاکلیٹ دیجئے نا!"

کتنی معصوم اور شیریں آواز ہے اُس کی جو سارے وجود میں رس گھول دیتی ہے۔ لیکن وہ چاکلیٹ کھا کر مر جائے تو میں اُس کی میٹھی میٹھی آواز کیسے سُن سکوں گا۔ نہیں نہیں! میں اسے چاکلیٹ کھانے نہیں دُوں گا ــــ وہ اُس کے ہاتھ میں دو چار چاکلیٹ اور تھما دیتا ہے اور وہ اپنے چھوٹے سے منھ میں ایک ساتھ دو دو، چار چار چاکلیٹ ٹھونس لیتا ہے۔

میری بے چین حالت دیکھ کر وہ سمجھ جاتا ہے کہ مجھے اس کی یہ حرکت پسند نہیں ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں اُسے ایسا کرنے سے روک بھی نہیں سکوں گا۔

اُسے میری بیوی کے ہاتھ کی بنی چائے بے حد پسند ہے۔

وہ چائے پی کر میری بیوی کی اس قدر تعریف کرتا ہے کہ میری بیوی سب کچھ بھول کر اس کی تعریف میں کھو جاتی ہے۔ گویا وہ اس کی تعریف کے سہارے ہی زندہ ہو۔ وہ بظاہر چائے مزے لے کر پیتا ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے انتہائی اذیت ناک کیفیت سے گزر رہا ہے۔ جیسے چائے اس کے حلق کو جلاتی ہوئی اس کے جگر کو کاٹ کر اندر پہنچ رہی ہو۔ وہ چائے گھونٹ ایسے پیتا ہے جیسے اسے سیالِ آتشیں پینے پر مجبور کیا گیا ہو۔ وہ اپنی اس کیفیت کو چھپانے کے لئے سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے لگتا ہے اور مجھے بھی سگریٹ پیش کرتا ہے۔

اس کا دیا ہوا سگریٹ جب میں اپنے ہونٹوں میں دبا کر اس کے اگلے سرے کو جلتی ہوئی ماچس کی تیلی سے چھوتا ہوں تو میرے اندر ایک انجانا سا خوف جاگ اٹھتا ہے کہ اب سگریٹ ایک دھماکے کے ساتھ اڑ جائے گا اور میرے وجود کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ ہر کش کے ساتھ خوف کی ایک نئی لہر مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اس پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں اس کا ساتھ دے رہا ہوں جلدی جلدی دو چار کش لگا کر سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دیتا ہوں۔ پھر بھی میرا اندرونی خوف اس سے چھپ نہیں پاتا۔ اور وہ میرے اس رویہ کو بھانپ لیتا ہے اور مسکراتا ہوا مجھے سگریٹ پر سگریٹ پیش کرتا ہے۔

اس کی شادی میں میں پیش پیش رہا تھا۔ تصویریں کھینچنے کا کام بھی میرے ہی ذمہ تھا۔ میں ایک کیمرہ اپنے گلے میں لٹکائے موقع بے موقع تصویریں کھینچنے لگا۔ فلیش کی تیز روشنی سے چونک کر سارے مہمان میری طرف متوجہ ہو جاتے تھے اور ہر کوئی مجھ سے فرمائش کرتا کہ میں اس کی تصویر اتاروں۔ لیکن

میں دیکھ رہا تھا کہ جب بھی میں کیمرے کی آنکھ اُس پر جما تا وہ سہم سا جاتا تھا اور اس کا چہرہ سخت تناؤ کا شکار ہو جاتا اور اس پر دہشت کی پرچھائیاں چھا جاتیں۔ میں اس سے مسکرانے کے لئے کہتا لیکن اُس کا پژمردہ چہرہ جیسے مسکرانا بھول گیا ہو۔ وہ کوشش کے باوجود مسکرانے میں ناکام رہتا۔ مجھے معلوم تھا وہ یقیناً یہ سوچ رہا ہے کہ کیمرے کی آنکھ سے کوئی شعاع نکل کر اُس کے دو ٹکڑے نہ بنا دے۔ وہ حتی الامکان کیمرے کی آنکھ سے بچتا رہا اور میں اُسے کیمرے کی زد میں لانے کی کوشش کرتا رہا۔ تصویریں دیکھ کر سب نے یہ محسوس کیا کہ اس کی کوئی تصویر صاف نہیں ہے۔ کسی میں وہ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ کسی میں اس نے اپنا چہرہ موڑ لیا ہے۔ کسی میں کسی مہمان کے پیچھے چھپ گیا ہے۔ کسی میں اُس نے اپنی دُلہن کو آگے کر دیا ہے۔ یہ بات ہے کہ تصویریں دیکھ کر اُس نے میری فوٹوگرافی کی تعریف کی تھی۔ کئی دنوں تک تصویریں اپنی دُلہن کو دکھا دکھا کر میری تعریفیں کرتا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ اُس کی یہ تعریفیں اس بات کی پردہ پوشی کا ایک بہانہ تھیں کہ وہ میرے کیمرہ کا سامنا کرنے سے گھبراتا رہا۔

ایک دن وہ میرے گھر ایک خوبصورت بکس لے آیا اور میری بیوی سے کہنے لگا ــــــــ

"بھابی! جلدی سے ایک کپ چائے پلا دیجئے۔ دیکھئے میں آپ کے لئے کیا لایا ہوں"

میری بیوی جلدی سے اُس کے لئے چائے بنا لائی اور اُس نے بکس میری بیوی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میری بیوی نے کھول کر دیکھا تو وہ ایک قیمتی میک اپ بکس تھا۔ اِس میں آرائش اور بناؤ سنگھار کی ہر چیز موجود تھی۔

دوسرے روز صبح صبح میری بیوی غسل سے فارغ ہو کر میک

اَپ بکس لے کر قدِ آدم آئینہ کے روبرو بیٹھ گئی اور اپنی آرائش میں مشغول ہو گئی۔ میرا دل دھڑک اُٹھا کہ کہیں میک اَپ بکس کی لِپ اِسٹک اس کے رسیلے ہونٹوں کی شادابی اور نازکی نہ چھین لے۔ غازہ سے اس کے دل کش چہرہ پر بدنما داغ نمودار نہ ہو جائیں کاجل سے اُس کی روشن آنکھوں کی بینائی نہ ختم ہو جائے۔ مَیں اُسے میک اَپ کرنے سے روک دینا چاہتا تھا۔ لیکن مَیں ایسا نہ کر سکا۔ وہ میک اَپ کر کے میرے سامنے آکھڑی ہوئی تو اُس کے چہرے کے حُسن و جمال سے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اتنی حسین وہ مجھے اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی۔ مَیں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ مسکرانے لگی۔

اُسے شجر کاری کا بہت شوق ہے۔ اُس کا باغ انواع واقسام کے رنگ برنگے خوشنما پھول اور پودوں سے آباد ہے۔ اس وقت باغ میں وہ ایک نیا پودا لگا رہا تھا۔ مَیں بھی اُس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ زمین کھود کر مٹی میں کھاد وغیرہ ملائی گئی اور پھر پودا نصب کیا گیا۔ اور مَیں نے پودے کو پانی دیا۔ مَیں پودے کو پانی دے رہا تھا تو اُس کی حالت غیر تھی۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میرے پانی دینے سے پودا سوکھ جائے گا اور اُس کے پتے اور شاخیں خشک ہو کر جھڑ جائیں گی۔

اُس کی بیوی ہمارے لئے ناشتہ تیار کر چکی تھی۔ ہم پودا لگا کر مُنہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کے لئے میز پر آبیٹھے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ مجھے اُس کے خیالات کا علم ہو گیا ہے۔ اور وہ میرے ذہن کو دوسری طرف منتقل کرنے کے لئے کہنے لگا کہ مَیں بھی اپنے گھر کے احاطہ میں ایک باغ لگاؤں۔ ہم نیچر سے کٹتے جا رہے ہیں۔ باغات لگا کر ہم نیچر سے اپنا رشتہ استوار کر سکتے ہیں۔ ماحول میں پیدا شدہ کثافتوں، آلودگیوں اور زہریلی ہواؤں کو پاک کرنے کا

فطری طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے گھروں میں باغات لگائیں اور ارد گرد ہرے بھرے شجر اگائیں۔ ناشتہ کرنے کے دوران اُس کی پریشانی حسبِ دستور برقرار رہی۔ وہ اپنے ذہن میں ابھی تک اس پودے کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے میں نے پانی دیا تھا۔

وہ حسبِ معمول شام کو میرے گھر آیا اور اپنے ساتھ بچوں کے لئے ٹافیاں اور چاکلیٹ بھی لے آیا۔ گھر میں آتے ہی بچوں نے اُسے گھیر لیا۔ اور میں نے اُس کے ہاتھ سے ٹافیاں اور چاکلیٹ لے لئے اور بچوں کو ڈانٹ کر باہر بھگا دیا۔ بچے ٹافیوں اور چاکلیٹ کے لئے اصرار کرتے رہے۔ وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور میں نے دانستہ اس سے ایک اہم معاملہ پر گفتگو چھیڑ دی۔ ہم دونوں مالی اشتراک سے زمین خرید رہے تھے جس پر ہم گنّے کی کاشت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ کیوں کہ یہاں حکومت شکر کی فیکٹری قائم کرنا چاہتی تھی۔ ان امور پر ہمارے درمیان دیر تک بات ہوتی رہی اور پھر وہ چلا گیا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ چائے پیے بغیر ہی چلا گیا تھا جو میری بیوی خصوصاً اُس کے لئے بنا لائی تھی۔

میں سوچتا ہوں کہ ہم دونوں ایسی شہد پی رہے ہیں جس میں نیم کے پیڑ کا رس بھی ملا ہوا ہے۔

○

خوشبو کا سفر

"شکار کتنا بے رحم مشغلہ ہے۔ معصوم جانوروں اور پرندوں کا خون" ــــ اس نے اپنے تیر و کمان پھینک دیئے اور جنگل کی اس خوشبو کے تعاقب میں نکل پڑا جو مدت سے اُسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

اس کے شکاری ساتھیوں نے جنگل کا چپہ چپہ چھان مارا۔ لیکن اس کا کہیں سُراغ نہ ملا۔ بالآخر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اُن کا شکاری ساتھی کسی خوں خوار جانور کا شکار بن گیا ہے۔

لیکن انہیں اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ایسا ممکن ہی نہیں کہ کوئی جانور اُس کے تیر کے نشانے سے بچ کر اس پر جوابی حملہ کیا ہو۔ اس کا نشانہ کبھی نہیں خطا ہوتا تھا۔ کمین گاہیں بنانے میں اُسے غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ جگہ اور درختوں کا اتنا صحیح اور مناسب انتخاب کرتا کہ چالاک سے چالاک جانور بھی بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ اور اس خوبصورتی سے جانوروں کا شکار کرتا کہ اُن کی کھال تک خراب نہیں ہوتی تھی۔ اس کے خیمے میں لٹکی ہوئی مختلف جانوروں کی بے داغ کھالیں اُس کے کمال کا ثبوت فراہم کرتی تھیں۔ جنگل کے خوفناک جانوروں کی لڑائی دیکھنے میں اُسے بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ جب جانور اپنے خونخوار نکیلے دانتوں اور ناخنوں سے ایک دوسرے کو زخمی کر لیتے اور اُن کے جسموں سے خون رِسنے لگتا تو اس کی شکاری طبیعت بھڑک اُٹھتی اور وہ بھی تیر کمان سنبھالے میدان میں کود پڑتا۔ اُسے معلوم تھا کہ جانور زخمی حالت میں انتہائی خوفناک ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ لیکن وہ موت سے کب ڈرنے والا تھا؛ وہ اپنی شکاری طبیعت کو تسکین پہنچانے کے لئے اپنی جان کی بازی تک لگا دیتا تھا۔ بھنا ہوا گوشت اس کی مرغوب غذا تھی اور وہ جانوروں کی کھال سے بنے ہوئے لباس پہنتا تھا۔ اس کے شکاری ساتھی مایوس و ناکام ہو کر شکار میں مشغول ہو گئے۔ لیکن اُس کے اس طرح اچانک غائب ہو جانے نے اُن کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔

وہ جنگل کی خوشبو کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف خوفناک پُرخار جھاڑیاں تھیں۔ دیو قامت بڑے بڑے درخت۔ دشوار گزار پیچیدہ راستے۔ جنگل کا پُرہول سناٹا۔

وہ بلا خوف و خطر خوشبو کے تعاقب میں چلا جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک دم سینے تک زمین میں دھنس گیا۔ اور وہ زمین پر جھولتی ہوئی درخت کی ایک شاخ کو نہ پکڑتا تو اُسے بھیانک دلدل نے پوری طرح نگل لیا ہوتا۔ جنگل کے ماحول سے خوب واقف ہونے کے باوجود وہ زرد پتوں کے نیچے منہ کھولے چھپے ہوئے خونخوار دلدل کو پہچان نہ سکا۔ اس کا دم حلق میں آکر اٹک گیا اور سانسیں اُکھڑنے لگیں۔ جس شاخ کو وہ تھامے ہوئے تھا وہ اتنی مضبوط نہیں تھی کہ جس کی مدد سے وہ دلدل سے باہر نکل آتا۔ اس کے سر کے اُوپر تھوڑی بلندی پر ایک مضبوط اور ہری ڈالی لٹک رہی تھی۔ اس ڈالی کو پکڑنے کے لئے وہ اپنے آپ کو جتنا اُوپر اُٹھانے کی کوشش کرتا دلدل اُسے اتنا ہی نیچے کی طرف کھینچتا۔ اس کش مکش میں اس کا سارا بدن نڈھال ہوگیا۔ اور اُسے ایسا لگا جیسے وہ دلدل میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ اتنے میں زور کی ہوا چلنا شروع ہوئی اور ہوا کے تیز جھکڑ سے سارے درخت ہلنے لگے۔ اس کے سر کے اُوپر لٹکتی ہوئی ایک شاخ ہوا سے جھولتی ہوئی جوں ہی نیچے کی طرف آئی اُس نے لپک کر اُسے پکڑ لیا۔ وہ کچھ دیر تک اُس شاخ کو تھامے رہا اور جب بدن میں کچھ جان آئی تو وہ اس مضبوط ڈالی کی مدد سے دلدل سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا بدن سینے تک دلدل کی گیلی مٹی سے لت پت ہوگیا تھا۔ وہ ڈالی کو پکڑ کر جھولتا ہوا درخت پر جا بیٹھا۔ درخت سے پتے توڑ کر اس نے جسم سے چپکی ہوئی دلدل کی مٹی پونچھی اور نظریں گھما کر جنگل کا جائزہ لینے لگا۔ یہاں سے جنگل کا دلدلی حصہ شروع ہوگیا تھا اور بیشمار بھیانک دلدل اپنے خونخوار منہ کھولے کھڑے تھے۔ وہ جس درخت پر بیٹھا ہوا تھا اس کی دائیں جانب سے ایک تنگ

پگڈنڈی جنگل کے اندر تک چلی گئی تھی۔ وہ بڑی احتیاط سے درخت سے نیچے اُتر آیا اور قدم سنبھالتا ہوا تنگ پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ پگڈنڈی کی دونوں جانب گھنی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جن کی کانٹوں بھری شاخیں پگڈنڈی پر پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ پُرخار شاخوں کو ہٹاتا ہوا آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ چند میل کے بعد یہ پگڈنڈی ایک پتلی سی نہر کے کنارے جا کر ختم ہو گئی تھی نہر کے ساتھ ساتھ پہاڑیوں کا طویل سلسلہ چلا گیا تھا۔ اسے نہر میں نہانے کی خواہش ہوئی اور اس نے نہر کے پاک وشفاف پانی میں غوطہ لگا دیا۔ وہ خوب نہانے کے بعد کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم سے ساری کثافت اور آلودگی دُھل گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا گیلا بدن بھی سوکھ گیا اور وہ نہر کے کنارے کھڑے ہوئے اُونچے پہاڑ پر چڑھ گیا۔ پہاڑ پر جگہ جگہ سوکھی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ خشکی کی وجہ سے جنگلی پودوں پر مُردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ پانی کے چشمے یا آبشار کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ پتھریلی چٹانوں سے حرارت نکل رہی تھی۔ جس کی وجہ سے پہاڑ چڑھتے ہوئے اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے پہاڑ کی نصف بلندی طے کی تھی کہ یکایک آسمان پر گھرے بادل چھا گئے۔ بجلیاں کوندنے لگیں اور زوردار بارش شروع ہو گئی۔ کافی دیر تک بارش ہوتی رہی اور پھر بادل چھٹنے لگے۔ آسمان آئینہ کی طرح صاف ہو گیا۔ یخ بستہ ہوا کے خوشگوار جھونکے چلنا شروع ہو گئے۔ سوکھی لمبی لمبی گھاس کسی مے خوار کی طرح جھومنے لگی۔ پژمُردہ جنگلی پودوں پر تازگی چھا گئی۔ پہاڑ کی بلند ترین چوٹیوں سے آبشار پھوٹ پڑے۔ پتھریلی چٹانیں برف کی طرح سرد ہو گئیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی تپتے ہوئے ریگستان سے ایک سبز وشاداب وادی میں آ گیا ہے۔ اب اُسے جنگل کی خوشبو تیزی سے محسوس ہو رہی

تھی۔ وہ سرعت سے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک طویل وعریض جنگل پھیلا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم جماتے ہوئے اس پار اُتر گیا۔ لیکن جنگل کے اندر داخل ہونے کے لئے کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں نے سارے جنگل کو گھیر رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے صدیوں سے اس گھنے جنگل میں انسان کا گزر نہیں ہوا ہے۔ وہ مشکل سے پُرخار جھاڑیوں میں راہ بناتا ہوا جنگل کے اندر داخل ہوگیا۔ چاروں طرف ہُو کا سا عالم تھا۔ اور گھنی جھاڑیوں اور بڑے بڑے درختوں کے عقب سے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ گھنے درختوں کی شاخیں اور پتے آپس میں اس قدر اُلجھے ہوئے تھے کہ سورج کی روشنی بڑی دشواری سے جنگل کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ زرد پتوں نے غیر مستطح زمین کو ڈھک لیا تھا۔ جس پر کسی ہموار کشادہ میدان کا گمان گزرتا تھا۔ وہ آگے بڑھتا ہوا کئی دفعہ ڈھلانوں میں جا گرا جس سے اُس کے ہاتھ پاؤں اور سر پر سخت چوٹیں آئیں۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا جا رہا تھا تاریکی دبیز ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ہر قدم پر اُسے جنگل کی خوشبو قریب آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جنگل کے قلب میں داخل ہوتے ہی خوشبو کی شدت سے اُس کے ہوش و حواس گم ہوگئے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اُسے خوشبو کے عمیق سمندر میں ڈبو دیا گیا ہے۔ وہ بے قرار نظروں سے اس جگہ کو ڈھونڈنے لگا جہاں سے خوشبو کے فوارے پھوٹ کر ساری فضا کو معطر کر رہے تھے۔ وہ ایک جگہ رک گیا جہاں ہری بھری بیلوں کے بڑے بڑے شاداب پتوں کا جھنڈ جھوم رہا تھا۔ اُس نے جھک کر بیلوں اور پتوں میں غور سے دیکھا۔ شاداب پتوں کے جھنڈ کے نیچے ایک چشمہ پوشیدہ تھا۔ اس نے جلدی جلدی ساری بیلوں اور پتوں کو ایکطرف ہٹا دیا۔ چھوٹے سے چشمہ میں خوبصورت سفید کنول نما پھول کھلا

ہوا تھا۔ جس سے مہکتی ہوئی بے پناہ خوشبو سارے جنگل کو مہکا رہی تھی۔ وہ گہری سانسیں لینے لگا۔ وہ اس ساری خوشبو کو اپنے اندر بسالینا چاہتا تھا۔ اس خوبصورت پھول کی لمبی لمبی نرم و نازک پنکھڑیوں سے سرخ رس کے قطرے ٹپک ٹپک کر چشمہ میں گر رہے تھے اور سارا چشمہ رس سے لبالب تھا۔ وہ چشمہ کے کنارے دوزانو بیٹھ گیا اور اس نے چشمہ سے رس کے دو گھونٹ پئے ہی تھے کہ اس پر نشہ سا طاری ہو گیا اور اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سارا وجود پھول کی طرح ہلکا ہو گیا ہے۔ اس کے ذہن و دل پر سکون سا چھا گیا ہے۔ اور اسے اپنے اندر ٹھنڈک سی محسوس ہو رہی تھی۔ اُف! کتنی راحت ہے! اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ اور جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اس نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی چمڑے کی چھوٹی سی تھیلی نکالی اور اس میں چشمہ سے رس بھر کر آبادی کا رخ کیا۔ خوفناک جنگلوں اور بھیانک پہاڑوں سے گزرتا ہوا وہ ایک بستی میں داخل ہوا۔ لوگوں نے اسے گھیر لیا اور وہ اسے عجیب و غریب نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ سر کے لمبے لمبے بال، چہرے پر بڑھی ہوئی گھنی داڑھی، آنکھوں میں غیر معمولی سی چمک، گمبھیر آواز۔ وہ مٹی کے ایک اونچے سے ٹیلے پر کھڑا ہو گیا اور لوگوں کو رس سے بھری ہوئی تھیلی دکھا کر مخاطب ہوا۔

"لوگو! میں تمہارے لئے ایک ایسا مشروب لایا ہوں جسے پی کر تمہارے سینوں میں صدیوں سے بھڑکتے ہوئے آگ کے خوفناک شعلے سرد پڑ جائیں گے۔ تمہاری رگوں میں دوڑتا ہوا تیزاب شہد میں تبدیل ہو جائے گا۔ تمہارے وجود کی ساری تلخیاں کافور ہو جائیں گی اور تمہاری زندگی ابدی سکون سے ہم کنار ہو جائے گی۔"

بستی کا کوئی بھی آدمی رس پینے کے لئے آمادہ
نہیں ہوا۔ وہ مسلسل لوگوں کو بلاتا رہا۔

سمندر کا قتل

سمندر کی پُرسکوت موجوں میں تلاطم پیدا ہوگیا۔ بڑے بڑے دیو ہیکل جہاز سمندر پر قابض ہوگئے۔ اور سمندر میں عجیب و غریب کاروائیاں ہونے لگیں۔ وہ بوڑھا خاموشی سے ان سب کاروائیوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔ اس نے پہلی بار ایسے جہاز دیکھے تھے جو اس کی کشتی سے بہت مختلف تھے۔ اُن کی ساخت اور بناوٹ بالکل ہی الگ تھی۔ ان جہازوں کا انحصار نہ تو بادبانوں پر تھا اور نہ ہی

وہ پتوار کی مدد سے چلتے تھے۔ وہ جہاز اپنے آپ چلنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُن کی رفتار کافی تیز تھی۔ اپنی بھاگ دوڑ سے ان جہازوں نے سارے سمندر میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔

وہ مشکوک نگاہوں سے ان جہازوں کو دیکھنے لگا۔ اُس کے دل و دماغ میں طرح طرح کے وسوسے سر اُٹھانے لگے۔ یقیناً کچھ ہونے والا ہے۔ وہ گھنٹوں ساحل پر کھڑا ان جہازوں کو تکتا رہتا۔ دھیرے دھیرے اُس کی پُرسکون زندگی پر خوف و ہراس کے مہیب بادل چھانے لگے۔ اور وہ فکرمند سا رہنے لگا۔ جس نرم ریت پر سوتے ہی اُسے نیند آجاتی تھی اب وہ ریت اُسے سخت محسوس ہونے لگی۔

روز بروز جہازوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور اُن کے کئی گروہ بن گئے۔ کسی جہاز پر سُرخ جھنڈی لہرا رہی تھی۔ کسی پر سبز۔ کسی پر سفید اور کسی پر سیاہ جھنڈی۔ دن رات سمندر کے سینے پر جہاز چلنے لگے جس سے سارے سمندر میں ہلچل سی پیدا ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یکایک ایک بھیانک طوفان آگیا ہو جو ساری دُنیا کو لے ڈوبے گا۔

وہ کئی دنوں سے نمک نہ بنا سکا۔ ہر صبح بستی والے اس کی راہ تکتے رہے۔ بستی والوں کو اس کا نمک بے حد پسند تھا۔ اُس کا سپید اور چمکتا ہوا نمک دیکھ کر وہ خوش ہو جاتے تھے۔ وہ آج نمک بنانے کے خیال سے منہ اندھیرے ہی نیند سے اُٹھ بیٹھا۔ شدید سردی پڑ رہی تھی۔ اُس نے اپنے کانوں پر کس کر تولیہ باندھ لیا۔ جسم سے ایک لمبی سی کالی چادر لپیٹ لی اور ضروری چیزیں لے کر سمندر کی طرف چل پڑا۔ ابھی سُورج کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ دُور سمندر میں کھڑے

جہازوں کی بتیاں روشن تھیں۔ چند قدم چلنے کے بعد اس کے پاؤں نہ جانے کس احساس سے ٹھٹک گئے اور وہ گم سُم سا کھڑا جہازوں کو دیکھنے لگا جو برابر اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ کوشش کے باوجود اُس کے قدم آگے بڑھنے کے لئے آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اپنی جھونپڑی میں واپس چلا آیا اور جھونپڑی کی دیوار سے سر لگائے بیٹھ گیا۔ لیکن اب بھی اُس کی نگاہیں برابر جہازوں پر جمی ہوئی تھیں۔ دن کافی چڑھ آیا۔ وہ نمک بنانے کے لئے نہ جا سکا۔ اور اب شام ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سا اُٹھ کر اپنی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ شام کا ڈوبتا سورج سُرخ نشان بنا سمندر پر کھڑا تھا۔

وہ ہر شام اپنی چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر گیت گاتا ہوا سمندر میں دُور دُور تک نکل جاتا تھا۔ اُسے سمندر سے بڑی گہری عقیدت تھی۔ پُرسکون سمندر کی بے کراں وسعتیں اُسے اپنی طرف بلاتی تھیں۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اُس مقام تک چلا جائے جہاں سمندر آسمان سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ لیکن اب سمندر میں اُس کی چھوٹی سی کشتی کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ بڑے بڑے جہازوں نے سارے سمندر کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اور ان جہازوں سے نکلتا ہوا زہریلا دُھواں سمندر کو قطرہ بہ قطرہ پی رہا تھا۔ وہ بے بس نظروں سے اپنی کشتی کو دیکھنے لگا جو سمندر سے نکال کر باہر ریت پر ڈال دی گئی تھی۔

اب سمندر میں مختلف گروہوں کے جہازوں کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی تھی۔ سمندر کے بڑے سے بڑے حصہ پر اپنے قدم جمانے کی کوشش میں ایک جہاز دوسرے جہاز کے مدِ مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ اور سمندر انگنت ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔

اُسے یقین ہو گیا کہ اب سمندر آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خوفناک شعلے رقص کرنے لگے اور جلتے ہوئے سمندر کی چیخ و پکار سُن کر اُس کا سارا وجود تھرّا اُٹھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر سمندر کو آگ کے شعلوں سے بچانا چاہتا تھا۔ وہ بستی کی طرف چل پڑا۔ اُس کے بستی میں داخل ہوتے ہی بستی کے سارے لوگ نمک کے لئے اس کی طرف ایسے دوڑ پڑے جیسے وہ نمک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن اُسے خالی ہاتھ دیکھ کر اُنہیں بے حد مایوسی ہوئی۔

"تم نمک نہیں لائے؟"

"سمندر کی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ آؤ ہم سب مل کر سمندر کو بچائیں۔ نہیں تو سارا سمندر آگ کی لپیٹ میں آجائے گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ان آنسوؤں میں دم توڑتا ہوا سمندر موج زن تھا۔

یہ سُن کر لوگوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور پھر اُنہوں نے اپنے اپنے گھروں میں جاکر دروازے بند کر لئے۔ یہ دیکھ کر پہلے تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ لیکن جب اُس نے ساری بستی میں خود کو تنہا پایا تو غم و غصے سے اس کا سارا بدن کانپنے لگا۔ وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو بلاتا رہا۔ لیکن ایک شخص بھی اپنے مکان سے باہر نہ نکلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری بستی میں ایک بھی آدمی نہیں ہے۔ کسی خطرے کی وجہ سے سارے لوگ بستی خالی کر کے چلے گئے ہیں اور اُن کے لوٹ آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ جبھی اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کی ساری توانائی ٹوٹ چکی ہے اور اس کے دست و پا مفلوج ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے بے جان بوڑھے جسم کو جیسے گھسیٹتا ہوا بستی

سے اپنی جھونپڑی تک لے آیا۔ رات کا خوفناک اندھیرا مسلط ہوچکا تھا۔ دم توڑتے ہوئے سمندر کی دردناک چیخیں اُبھر رہی تھیں۔ جہازوں نے سارے سمندر کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔

دُوسرے دن چند اجنبی اُس کی جھونپڑی میں گھُس آئے۔ وہ ہتھیاروں سے لیس تھے۔ ان آدمیوں کو اپنی جھونپڑی میں گھُس آتے دیکھ کر وہ غصّہ سے اُٹھ کھڑا ہوگیا جیسے وہ بھی مقابلے کے لئے مستعد ہے۔ غم و غصّہ سے اس کے جسم کا سارا خون اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔

"بوڑھے! تمہیں ہماری طرفداری کرنی ہوگی۔ اگر تم نے دوسروں کا ساتھ دیا تو تمہاری خیر نہیں! سمجھے!"——دھمکی دے کر وہ آدمی چلے گئے۔

اُن آدمیوں کے جانے کے کچھ دیر بعد چند اور آدمی اس کی جھونپڑی میں گھُس آئے۔ اُن کے ہاتھوں میں خطرناک ہتھیار تھے۔ ایک نے اُس کی گردن پکڑ لی۔

"بوڑھے! اگر تم نے ہمارے سوا کسی کی مدد کی تو ہم تمہاری اس جھونپڑی کو آگ لگادیں گے۔"——دھمکی دے کر وہ آدمی بھی چلے گئے۔ وہ ریت پر بے حال پڑا بے بس نظروں سے اپنی جھونپڑی کو دیکھنے لگا جو سوکھے پتوں سے بنی ہوئی تھی اور جسے جلا کر راکھ کر دینے کے لئے آگ کی ایک چھوٹی سی چنگاری کافی تھی۔

اسی روز آدھی رات کو آگ کا ایک گولہ اس کی جھونپڑی پر آگرا۔ اس سے پہلے کہ جھونپڑی جل کر اس پر گر پڑتی وہ ایک ہی چھلانگ میں جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے جھونپڑی جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی۔ اور اُدھر سارے سمندر میں بھیانک آگ لگی ہوئی تھی اور آگ کے

بھڑکتے ہوئے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے۔ تا حدِ نگاہ آگ ہی آگ بھڑک رہی تھی جو تیزی سے سارے سمندر کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ ایک جہاز دوسرے جہاز پر مسلسل آگ کے گولے برسا رہا تھا۔ کوئی جہاز آگ کی زد سے نہ بچ سکا۔ ساری رات آگ کے خوفناک گولے برستے رہے۔ صبح تک سارے کے سارے جہاز جل کر تباہ ہو گئے۔ انگنت جہاز سمندر کی تہہ میں غرق ہو گئے۔ بے شمار جہاز جل کر بے کار ہو گئے۔ ایک آدمی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ سب کے سب موت کے گھاٹ اتر گئے۔ کتنے سمندر میں ڈوب کر لاپتہ ہو گئے۔ کتنے جہازوں کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئے۔ کتنے ساحل پر مُردہ پڑے رہے۔ سارا سمندر تباہی کا خوفناک منظر بنا ہوا تھا۔

وہ دھیمے دھیمے قدموں سے چلتا ہوا سمندر تک آیا اور اپنی بجھی بجھی آنکھوں سے سمندر کو دیکھنے لگا۔ سمندر کا پانی اب نمک بنانے کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔ سارا سمندر انسانوں کے خون سے سُرخ ہو چکا تھا۔

ڈھانچہ

کھدائی جاری ہے۔ دشت وجبل کھودے گئے۔ قریہ وشہر کھودے گئے۔ دریا وصحرا کھودے گئے۔ جہاں تک کھودو وہاں تک مٹی ہی مٹی ہے۔ مٹی ـــــ نرم، سخت، چکنی، رتیلی، زرد، سیاہ، سُرخ، سفید، وقت موسم اور آب وہوا کے ساتھ بدلتی ہوئی۔ طبق در طبق۔ ہر طبق ایک مختلف رنگ، ایک مختلف نوع۔ کہیں سخت چٹانوں کا سلسلہ۔ کہیں زمین دوز پانی کے چشمے۔ کہیں گہری تاریک سُرنگیں۔ کہیں آتش فشاں

کے دہانے۔ کہیں کچھ دھاتوں کے ذخائر۔ کھدائی کا عمل کب سے جاری ہے اس کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہے۔ شاید کھدائی کا عمل زمین کے معرضِ وجود میں آنے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالشت بھر گہرائی تک ہی رسائی ممکن ہو سکی ہے۔

کھدائی کے دوران مٹی کے ساتھ برآمد ہونے والی ہڈیوں کو جوڑ کر ایک انسانی ڈھانچے کی تشکیل کی کوشش کی جا رہی تھی۔ انسانی ڈھانچے کی تشکیل کی کوششوں میں ہزار ہا پیچیدہ اور ناقابلِ فہم مشکلات حائل ہیں۔ اور ہڈیوں کی وضع، قیام اور شناخت کا کام ایک دقت طلب کام ہے۔ ان ہڈیوں کی عمر کیا ہے۔ اس کا قطعی علم نہیں ہے۔ شاید ان ہڈیوں کی عمر بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی خود مٹی کی عمر۔

ہڈیوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ کھوپڑی کی ہڈیوں کو جوڑا جاتا ہے تو چہرے کی عجیب سی شکل بن جاتی ہے۔ چہرے کی ہڈیوں کو صحیح کیا جاتا ہے تو جبڑے اپنی جگہ پر نہیں بیٹھتے۔ جبڑے کی ہڈیوں کو درست کیا جاتا ہے تو کھوپڑی بگڑنے لگتی ہے۔ بہ دقت گردن کے فقروں کو سیدھا کیا جاتا ہے۔ اور جب بازوؤں کی ہڈیوں کو برابر کیا جاتا ہے تو کھوپڑی گردن سے سرکنے لگتی ہے۔ ہاتھوں کی ہڈیوں کو بازوؤں سے متصل کیا جاتا ہے تو گردن کے فقرے ایک دوسرے سے الگ ہونے لگتے ہیں۔ ریڑھ کی تشکیل ایک پیچیدہ صورت اختیار کر جاتی ہے۔ ریڑھ کے فقروں کے قوس، عنیق اور زوائد ایک دوسرے میں نہیں بیٹھتے ہیں۔ جس کے سبب فقروں کی ترتیب نامکمل رہ جاتی ہے۔ سینے اور پسلیوں کے سرے ریڑھ کے فقروں سے الگ رہ جاتے ہیں۔ کولہوں کے ساتھ پیروں کی ہڈیوں کو جوڑا جاتا ہے

تو کولہوں اور ریڑھ کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ مسلسل کوششوں کے باوجود ایک انسانی ڈھانچے کی تشکیل پائے تکمیل کو نہیں پہنچتی ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ کھوپڑی کی جگہ کولہے، چہرے کی جگہ سینے، ریڑھ کی جگہ بازوں اور ہاتھوں کی جگہ پیروں کی ہڈیاں لگا دی گئی ہوں۔

اپنی کوششوں اور طریقۂ کار کا از سرِ نو جائزہ لیا جاتا ہے اور ایک مرتبہ پھر انسانی ڈھانچے کی تشکیل کی سعی کی جاتی ہے۔ اس بار ایک مختلف الہیّت ڈھانچہ تشکیل پاتا ہے۔ ممکن ہے کبھی انسانی ڈھانچے کی کوئی ایک شکل نہ رہی ہو۔ ہر عہد میں اس کی علیحدہ شکل اور جداگانہ صورت رہی ہو اور وقت اور زمانے کے ساتھ تغیر سے دوچار ہوتی رہی ہو۔

اس مختلف الہیّت اور عجیب و غریب ڈھانچے پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ڈھانچے کی تشکیل میں انسانی ہڈیوں کے ساتھ غیر انسانی ہڈیاں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ انسانی ہڈیوں کو غیر انسانی ہڈیوں سے الگ کرنا ایک امرِ محال ہے۔ ہڈیوں کی ابتدائی ساخت اور شکل کیا تھی اس کی صحیح معلومات دستیاب نہیں ہیں۔ کیا ابتدا میں ہڈیوں کی شکل غیر انسانی تھی جو بتدریج انسانی صورت اختیار کرتی گئی یا اس کے برعکس ابتدا میں ان کی صورت انسانی تھی جو آہستہ آہستہ غیر انسانی شکل حاصل کرتی گئی۔ گردشِ دوراں کے ساتھ انسانی اور غیر انسانی ہڈیوں میں تمیز مٹ گئی ہے اور دونوں کی ہیئت اور شکل ایک جیسی ہو گئی ہے۔ ایک ایک ہڈی کو بغور دیکھنے، ساخت اور ہیئت کا جائزہ لینے کے بعد علیحدہ کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات باوثوق سے نہیں کہی جا سکتی کہ جن ہڈیوں کو غیر انسانی سمجھ کر الگ کیا جا رہا ہے وہ واقعی غیر

انسانی ہیں۔ اور پھر اس بات پر اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں کہ جن ہڈیوں کو غیر انسانی سمجھ کر علیحدہ کر دیا گیا ہے وہ بھی انسانی ہیں۔ دراصل انسانی اور غیر انسانی ہڈیوں کی تفریق ہی عبث ہے۔

جب ایک انسانی ڈھانچے کی تشکیل کی سعی ناکام ہو جاتی ہے تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ابھی کھدائی نامکمل ہے اور ابھی تک جو ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں وہ ناکافی ہیں۔

کھدائی تیز تر کر دی جاتی ہے۔ گہری مٹی سے کثیر تعداد میں ہڈیاں برآمد ہوتی ہیں۔ ان ہڈیوں کی مدد سے ایک بار پھر انسانی ڈھانچے کی تشکیل کی کوشش کی جاتی ہے۔ احتیاط اور مہارت سے ہر ہڈی کو اپنی اپنی جگہ بٹھایا جاتا ہے۔ ریڑھ کے فقروں کی سلسلہ وار ترتیب میں دقتیں درپیش آتی ہیں۔ اور پھر سینے اور پسلیوں کی ہڈیوں کو ریڑھ کے فقروں کے ساتھ ملانا ایک دشوار گزار کام ہے۔ کھوپڑی، چہرے اور جبڑے کی ہڈیوں کو جوڑنے کے لئے گہری توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بازوں ہاتھ اور پیروں کے جوڑوں کو ترتیب دینے میں کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ بالآخر ایک انسانی ڈھانچے کی تشکیل پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ لیکن یہ ڈھانچہ تادیر قائم نہیں رہتا۔ ڈھانچے کی کوئی نہ کوئی ہڈی مقامِ اتصال سے ہٹ جاتی ہے اور سارا ڈھانچہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

سخت شرمندگی اور شدید ہزیمت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ہزارہا سوالات سر اٹھاتے ہیں۔ مختلف نظریات معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ انگنت شک و شبہات جڑ پکڑتے ہیں۔

کھدائی کے کام کو مزید تیز کر دیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہڈیاں جمع کی جاتی ہیں۔ ڈھانچے کی تشکیل میں جدید طریقے اور نئے ہنر بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ نئے زاویوں سے سوچا جاتا ہے۔

جدید علوم، جدید معلومات اور جدید نقطۂ نگاہ کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ ڈھانچہ کا وہ کونسا حصہ ہے جس کی ترتیب و تشکیل میں غلطی سرزد ہو رہی ہے۔ وہ کونسی ہڈی ہے جس کے غلط استعمال سے سارا ڈھانچہ تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ کبھی گمان گزرتا ہے کہ کھوپڑی اور چہرے کی ہڈیوں کو جوڑنے میں ناکامی ہو رہی ہے۔ کبھی شک ہوتا ہے کہ سینے اور پسلیوں کی ہڈیوں کو ملانے میں غلطی ہو رہی ہے۔ کبھی خیال آتا ہے کہ ریڑھ کے فقروں کی ترتیب میں کوئی نقص رہ جاتا ہے۔ یا پھر بازوں، ہاتھ پاؤں اور کولہوں کے جوڑوں کو صحیح نہیں بٹھایا جا رہا ہے۔ انسانی ڈھانچے میں تمام ہڈیاں ایک ہی طریقے پر نہیں جڑتیں۔ بلکہ مختلف طریقوں پر ایک دوسرے سے جڑتی اور ملتی ہیں اور اس طرح مختلف جوڑ بناتی ہیں۔ ان جوڑوں کی حرکتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی جوڑ وسیع حرکت کا حامل ہوتا ہے۔ کوئی کم قابل حرکت ہوتا ہے۔ کسی کی حرکت محدود اور یک طرفہ ہوتی ہے۔ کسی میں محض پھیلنے اور سکڑنے کی حرکت ہوتی ہے۔ کوئی جوڑ ہر دو طرف حرکت کرتا ہے اور کوئی غیر متحرک ہوتا ہے۔ اُن کی شکل اور ترتیب کا انحصار انکی حرکت اور فعل پر ہوتا ہے۔ انسانی ڈھانچے کی ہڈیوں اور جوڑوں میں غیر معمولی توازن پایا جاتا ہے اور یہی توازن ہے جو سارے ڈھانچے میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور اُسے قائم رکھتا ہے۔

از سر نو انسانی ڈھانچے کی تشکیل کی کوشش کی جاتی ہے۔ انتہائی باریک بینی اور گہری توجہ سے ہڈیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اُن کی ساخت، ہیئت اور شکلوں کا بغور جائزہ لے کر اُنہیں بیحد ہنرمندی سے ڈھانچے کی تشکیل میں شامل کیا جاتا ہے۔ لیکن

انسانی ڈھانچے کی تشکیل ایک مرتبہ پھر مشکل ترین مرحلے میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایک ہڈی دوسری ہڈی کو قبول نہیں کرتی۔ کھوپڑی، گردن پر نہیں بیٹھتی۔ چہرہ، جبڑے کی ہڈیوں کو الگ کر دیتا ہے۔ بازوں سے ہاتھوں کی ہڈیاں نہیں جڑتیں۔ ریڑھ کے فقرے علیحدہ رہ جاتے ہیں۔ سینے اور پسلیوں کی ہڈیاں معلق رہ جاتی ہیں۔ کولہے، پیروں کی ہڈیوں کو رد کر دیتے ہیں۔ ٹخنوں، گھٹنوں، ہتھیلی، کلائی اور انگلیوں کی ہڈیاں ایک دوسرے میں خلط ملط ہو جاتی ہیں۔

ایک انتہائی پیچیدہ اور ناگفتہ بہ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔ تمام کوششیں انتشار اور افراتفری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ سارے نظریات اور خیالات شیشے کے مکانوں کی طرح پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ ساری معلومات اور سارے تجربے ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں۔ سارا علم اور ساری ہنرمندی کاغذی کشتیوں کی طرح تہ آب ہو جاتی ہے۔

تاحال ایک مکمل انسانی ڈھانچے کی تشکیل کی کوشش شرمندۂ خواب نہیں ہو سکی ہے۔

شکستہ قوس

"سر، ایک خاتون آپ سے ملاقات کی خواہشمند ہیں۔ اپنا نام مسز اشرف بتاتی ہیں۔" ــــ انٹرکام پر للی نے مجھے مطلع کیا۔

مسز اشرف! یہ نام میرے لئے اجنبی تھا۔ شاید کوئی [illegible] ہوں گی ــــ میں نے سوچتے ہوئے للی سے کہا ــــ "ٹھیک ہے۔ اُن سے کہو کچھ دیر انتظار کریں۔"

میں فی الوقت اپنے کیبن میں ایک شخص سے

معروف گفتگو تھا جو ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک ہے اور اپنے ہوٹل کی ڈیکوریشن کے سلسلہ میں مجھ سے تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

میں ایک پیشہ ور انٹیریر ڈیزائنر ہوں اور ایک ڈیکوریشن کمپنی کا مالک۔ کارکردگی کے اعتبار سے ہماری کمپنی شہر کی ایک مشہور و معروف کمپنی ہے۔ شہر کے بڑے بڑے ہوٹلوں، عالیشان بزنس کامپلکس اور خوبصورت مکانات کی ڈیکوریشن ہمارے کارنامے ہیں۔

میرا پیشہ نہایت نازک، بے حد حساس اور بڑا مشکل پیشہ ہے۔ گاہک کے ذوق، اس کا نقطۂ جمال، اس کے مزاج کے مختلف پہلوؤں اور اس کی نفسیات اور ذہنیت کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ معمولی سی بھی غفلت اور بے اعتنائی اجتماعی کارکردگی پر منفی اثرات مرتب کر سکتی ہے اور کمپنی کے نام پر حرف آسکتا ہے۔ اس کے علاوہ نقصانات کا خمیازہ الگ۔

فائیو اسٹار ہوٹل کے مالک سے فارغ ہو کر میں انٹرکام پر للی سے مخاطب ہوا ــــــ

"للی، مسز اشرف کو اندر بھیج دو۔" ــــ میں ریسور رکھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

دفعتاً ایک کیف آور خوشبو کی لہر میرے کیبن میں در آئی جیسے میرے کیبن کا کوئی دریچہ کسی پھولوں بھرے باغ کی جانب کھل گیا ہو۔ خوش گوار حیرت سے میں نے دروازہ کی جانب دیکھا۔ مسز اشرف میرے کیبن میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایک حسین اور باتمکنت عورت! نہ معلوم کیوں غیر شعوری طور پر میری نظریں ان کے دلکش چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ میں جانتا

ہوں کہ خاتون گاہکوں کے چہروں پر نظر جمانا عیب میں شمار ہے اور پیشِ تر اس سے کہ مسز اشرف میری اس نازیبا حرکت کو محسوس کرتیں میں نے اپنی نظریں جھکالیں اور اپنی کرسی سے قدرے اٹھتے ہوئے میز کے روبرو رکھی ہوئی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ——

"تشریف رکھئیے!"

"شکریہ!" —— نہایت مہذب انداز سے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسز اشرف نے شائستگی سے شکریہ ادا کیا۔

مجھے محسوس ہوا جیسے سازِ موسیقی کے کسی حساس اور نازک تار کو آہستگی سے جنبش دی گئی ہو۔ فضا میں ایک ترنم اُبھرا۔

"فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں"——

میں خالص پیشہ ورانہ انداز میں مخاطب ہوا۔

"میں اپنے بنگلے کی ڈیکوریشن کے سلسلہ میں آپ کی کمپنی کی خدمات حاصل کرنا چاہتی ہوں" —— پُراعتماد لہجے میں مسز اشرف گویا ہوئیں۔

"یہ بنگلے کا نقشہ ہے" —— اک شانِ بے نیازی سے مسز اشرف نے بنگلے کا نقشہ میری طرف بڑھا دیا اور میں نے ان سے نقشہ لے کر اپنی میز کی شفاف شیشے کی سطح پر پھیلا دیا۔

خاصے وسیع رقبہ پر بنگلہ تعمیر کیا گیا تھا اور ہر کمرہ شکل اور ساخت کے لحاظ سے بہترین کاریگری کا نمونہ تھا۔ اور کمروں کی ترتیب و تنظیم بھی خوب تھی۔

نقشہ دیکھتے ہوئے میں مسز اشرف کے حسین سراپا پر ایک دزدیدہ نگاہ ڈال لیتا تھا۔ صراحی دار گردن میں آنکھوں کو خیرہ کردینے والا نکلس۔ یہ نکلس یقیناً اصلی ہیروں کا ہوگا۔ کیوں کہ

مصنوعی پتھروں میں اس نوع کی چمک نہیں ہوتی ہے۔ ویسے ڈیکوریشن کے شعبے میں کام کرنے والے کی آنکھیں جوہر شناس ہوتی ہیں اور اصلی و نقلی چیزوں میں تمیز کرنے کی اُن میں صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ خوبصورت چہرے کی مناسبت سے سادہ لیکن نفیس میک اپ۔ گُداز شانوں پر لہراتی ہوئی تراشیدہ سیاہ زلفیں۔ پُرشباب بدن پر قیمتی اور خوش نما لباس۔ دائیں ہاتھ کی گوری گوری کلائی میں جھولتی ہوئی سونے کی ہلکی سی زنجیر۔ میرا کیبن پہلے ہی سے جدید طرز کی پینٹنگز، رنگین تصاویر اور دُوسری جاذبِ نگاہ چیزوں سے آراستہ تھا۔ مسز اشرف کی موجودگی سے اُس کی دل کشی اور جاذبیت میں مزید اضافہ ہوگیا بلکہ یُوں کہنا بہتر ہوگا کہ مسز اشرف کی شرکت سے میرے کیبن کی تزئین و آرائش اپنی تکمیل کو پہنچ گئی۔

"آپ کا بنگلہ واقعی شاندار ہے"۔۔۔ میری بات سُن کر مسز اشرف کے سُرخ لبوں پر تبسم کے جگنو چمک اُٹھے اور نیم باز آنکھوں کی گھنی دراز پلکوں کے ریشمی کناروں پر ستارے روشن ہوگئے۔ گویا میں نے بنگلے کی نہیں، خود اُن کے حسین سراپا کی تعریف کی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ اس توصیفی جملے میں مَیں نے پیشہ ورانہ طرزِ اسلوب سے کام لیا تھا، لیکن یہ بنگلہ حقیقتاً ہر زاویہ اور گوشے سے قابلِ تعریف تھا۔

"مَیں خود چل کر آپ کا بنگلہ دیکھنا چاہتا ہوں"۔ مَیں نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔

"بہتر ہوگا!"۔۔۔ اس مختصر سے جواب سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مسز اشرف خود بھی یہی چاہتی تھیں کہ مَیں بہ نفسِ نفیس چل کر بنگلہ دیکھ لُوں تاکہ اپنے کام کو بہتر طور پر سمجھ سکوں اور کام کے دَوران کسی قسم کی پریشانی درپیش نہ ہو اور کام مسز اشرف کے حسب

نشا ہو۔

مسز اشرف اپنے بنگلے کا پتہ بتا کر اور اگلے روز کا وقت لے کر رخصت ہوئیں۔

مَیں نے اتنی خود اعتماد، باوقار اور خوبصورت عورت کبھی نہیں دیکھی تھی۔ مَیں پہلی ہی ملاقات میں مسز اشرف کی سحر انگیز شخصیت سے از حد متاثر ہوا اور چاہتا تھا کہ اُن کے بنگلے کا کام کسی بھی طرح حاصل کر لوں۔ کیوں کہ اتنے بڑے اور شاندار پروجیکٹ پر کام کرنا کمپنی کے لئے یقیناً قابلِ فخر بات تھی اور اس سے شہر میں اس کی ساکھ مزید مستحکم ہوتی تھی۔

اُگلے روز مَیں حسبِ معمول اپنے دفتر پہنچا اور عملے کو مختلف پروجیکٹس کے متعلق ضروری معلومات فراہم کر کے اپنی کار میں بیٹھ کر وعدے کے مطابق مسز اشرف کے بنگلے کی طرف رواں ہو گیا۔ میری کار کل تک گرد و غبار میں اٹی ہوئی تھی۔ لیکن آج صبح میں نے اُسے اچھی طرح سے واش کروایا اور خود بھی اپنی پسند کا عمدہ سوٹ پہن کر گھر سے نکلا۔ دفتر میں للی مجھ پر ایک سرسری سی نگاہ ڈال کر مسکرائی تھی۔ یہ وہ پیشہ ورانہ حربے ہیں جنہیں بعض مخصوص موقعوں پر ملحوظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مَیں دراصل کسی بھی طرح مسز اشرف کو متاثر کرنا چاہتا تھا۔

مطلوبہ بنگلہ شہر کے جس علاقہ میں واقع تھا۔ وہ نہایت مہنگا علاقہ تھا جہاں کی مٹی سونے سے زیادہ قیمت کی حامل تھی۔ اس پُر فضا اور پاک و صاف علاقے میں اعلیٰ صنعت کار، نامور تاجر، بڑے بڑے سرمایہ دار اور اُونچے اُونچے سیاسی و سماجی عہدوں پر فائز افراد سکونت پذیر تھے۔

میرے سامنے ایک پُر شکوہ عمارت کھڑی تھی۔ گو کہ عمارت کی زنگی چھت اور دیواریں ابھی رنگ و روغن سے

عارضی تھیں اور ان پر صرف سمنٹ کا پلستر چڑھا ہوا تھا اس کے باوجود عمارت اپنی ظاہری شکل اور ساخت سے شاندار معلوم ہو رہی تھی۔ اس علاقہ میں اس پایے کی ایک عمارت بھی نہیں تھی۔

اپنی کار ایک جانب روک کر میں نیچے اترا اور عمارت کی طرف بڑھا۔ کشادہ گیٹ پر ایک خوبرو نوجوان چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر موٹی اور کالی کالی مونچھیں اس کے اپنے فرض کی انجام دہی میں معاون ثابت ہو رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر مونچھیں خوب لگتی تھیں۔ اس نے خالص فوجی انداز میں مجھے سلام کیا اور جواباً میں نے اپنے سر کو جنبش دی اور گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

عمارت کے اندر شاید صفائی ہو رہی تھی۔ غیر ضروری ریتی، سمنٹ، پتھر اور لوہے کی سلاخیں ہٹائی جا رہی تھیں۔ اور مسز اشرف مزدوروں کو ہدایت دے رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے پر شگفتہ تبسم کا ایک ہلکا سا تاثر ابھرا۔

"میں آپ ہی کا انتظار کر رہی تھی" — ان کے انداز تخاطب میں خلوص اور اعتماد کا امتزاج شامل تھا۔

"آئیے!" — میں ان کے ہمراہ عمارت کے اندر داخل ہوا اور ان کے سراپا سے پھوٹتی ہوئی کیف آور خوشبو میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"یہ ہے ڈرائنگ روم" — میں اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی نوٹ بک اور قلم لے کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ کیوں کہ مجھے مسز اشرف کی باتیں احتیاط سے نوٹ کرنی تھیں۔ اور اگر معلومات کی منتقلی میں ذرا سی بھی غلطی سرزد ہوتی ہے

تو بڑی مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔ مسز اشرف نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا ——

"اس کمرے کی ڈیکوریشن بے مثال اور ......" ——

مسز اشرف اچانک اپنی بات کو کاٹ کر اس جانب متوجہ ہو گئیں جہاں سے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز آئی تھی۔ وہ جلدی سے جائے واقعہ پر پہنچیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ تھا۔ صفائی کے دَوران کسی مزدور کے ہاتھوں سے کوئی وزنی چیز چھُوٹ گئی تھی جس سے بنگلے کے صدر دروازے سے ملحق نصف دائرہ نما زینے کا ایک کنارا ٹوٹ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر مسز اشرف آپے سے باہر ہو گئیں۔ غصّہ کی شدّت سے اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُن کے چہرے اور گلے کی رگیں اس شدّت سے تن گئیں جیسے اُن سے سُرخ سُرخ خون اُبل پڑے گا۔ اُن کا سانس تیزی سے پھُولنے لگا۔ ایک مہذب، باتمکنت اور نرم خُو عورت اس قدر غیظ و غضب کا شکار ہو سکتی ہے مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ مسز اشرف کی شخصیت کے مخفی گوشے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے۔

ہم واپس ڈرائنگ روم میں آ گئے اور مسز اشرف اس کمرے کی ڈیکوریشن کے متعلق مختلف پہلو سمجھاتی رہیں۔ ڈیکوریشن کے متعلق مسز اشرف کی معلومات کافی وسیع اور جدید تھیں۔ اور ایک ایک چیز کی تفصیلات بیان کرتی جا رہی تھیں۔ ہم ڈرائنگ روم سے لوینگ روم پہنچے۔ لوینگ روم سے چل کر ڈاینگ روم میں آئے۔ وہاں سے کچن میں داخل ہوئے۔ کچن سے نکل کر بچوّں کے کمروں میں پہنچے۔ اور پھر ڈریسنگ روم اور آخر میں بیڈ روم میں آئے۔ بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی نا معلوم کیوں مسز اشرف کے چہرے کی بشاشت ایک لمحہ کے لئے فق

ہوگئی۔ لیکن انہوں نے جلد اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا ـــــ

"بیڈرُوم جنّت نما ہونا چاہیئے۔ آپ ہر چیز میں نفاست اور خوبصورتی کو ملحوظ رکھیں۔ ایک کمرے کی ڈیکوریشن دوسرے کمرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی اُن میں ایک طرح کی خوبصورت ہم آہنگی اور مناسبت کا احساس ہو۔ اور ایک بات یاد رکھئے گا کہ مجھے بدصُورتی اور بدنمائی سے سخت نفرت ہے۔" ـــــ وہ بے تکلف ہو کر بات کر رہی تھیں۔

"مسز اشرف صاحبہ، آپ یقین رکھیں، بنگلے کی ڈیکوریشن آپ کی خواہش کے مطابق بے مثال ہوگی۔" ـــــ میں نے مسز اشرف سے آنکھیں چار کیں اور پُراعتماد لہجے میں انہیں یقین دلایا۔

ڈیزائنوں اور ڈیکوریشن کی تفصیلات مکمل کرنے میں ایک طویل عرصہ لگ گیا۔ مسز اشرف جلد مطمئن ہونے والوں میں سے نہیں تھیں۔ وہ بار بار اپنے خیالات بدلتی رہیں اور اُن کی خواہشات کو شکل وصورت اور رنگ و روغن عطا کرنا بہت مشکل تھا۔ بالآخر اُن کی منظوری حاصل کرنے کے بعد کام کا آغاز کر دیا گیا۔ چار پانچ ماہ تک کام بحسن وخوبی چلتا رہا۔ اور اس کے بعد سے مسز اشرف کی دخل اندازیوں نے مشکلات پیدا کرنا شروع کر دیں۔ اُن کی روز روز کی شکایتوں سے میں تنگ آگیا تھا۔ اُن کی شکایتوں اور اعتراضات کی ایک طویل فہرست تھی ـــــ کچن کے فرش کی ٹائلوں کی سطح ناہموار ہے۔ ڈائننگ ٹیبل کی کرسیاں شاہانہ طرز کی نہیں ہیں۔ لیونگ رُوم میں رنگوں کا امتزاج جاذبِ نظر

نہیں ہے۔ بچوں کے کمروں کی دیواروں پر لگا وال پیپر بچوں کی ذہنیت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ڈرائنگ روم کی مصنوعی چھت کسی قدر اوپر اٹھ گئی ہے۔ ڈریسنگ روم کی الماریاں اور شلف دل کش نہیں ہیں۔ بیڈ روم میں آئینے غلط زاویوں میں لگے ہیں اور سوئمنگ پول میں روشنیوں کی ترتیب صحیح نہیں ہے ـــــــ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ کام اُن کی خواہش کے مطابق اُن کے منظور کردہ ڈیزائنوں پر ہو رہا ہے اور درمیان میں اس طرح کی مداخلت کام کی رفتار اور معیار کو متاثر کر سکتی ہے۔ ہر کام کی ایک تکنیک اور طریقۂ کار ہوتا ہے۔ لیکن مسز اشرف اپنی ہی بات پر قائم رہیں۔ اُن کا رویہ بے حد سخت اور غیر لچکدار ہوتا جا رہا تھا۔ اور بعض اوقات تو وہ کاریگروں پر چیخ اٹھتی تھیں۔ اُن کی حالت اُس مریض جیسی ہو جاتی تھی جس کا فشارِ خون اچانک بلند ہو گیا ہو۔ اُن کے مزاج میں تلخی و تندی شامل ہو جاتی تھی اور وہ اعتدال کی حدوں سے تجاوز کر جاتی تھیں۔

مسز اشرف کے رویّے سے بیزار ہو کر میں نے اُن کے شوہر اشرف شیخ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ویسے ابتک اشرف شیخ سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ صرف ان کا نام سن رکھا تھا۔ اُن کا شمار شہر کے چوٹی کے تاجروں میں ہوتا تھا اور وہ بلاشبہ ایک مصروف ترین آدمی تھے۔ پیشگی رقم کے طور پر چیک ملا تو اُن کا دستخط دیکھنے کو ملا اور دستخط دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ کافی عجلت میں کیا گیا ہے۔ اُن سے مسلسل کوشش کے باوجود ملاقات کی صورت پیدا نہ ہو سکی اور مجھے مسز اشرف کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ میں مسز اشرف کی بلند ذوقی اور ذہنی و شعوری بالیدگی کا قائل تھا۔ اور وہ نہایت باریک بین واقع

ہوئی تھیں۔ لیکن میرے کام میں اُن کی بے جا مداخلت میرے لئے دردِ سر کا باعث بن گئی اور کاریگر بھی اُن سے بدظن ہوتے جارہے تھے۔ وہ ایک چیز کو جب تک کئی مرتبہ توڑ کر نہیں بنوائیں انہیں اطمینان حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ایک سال کے عرصے میں بنگلے کی ڈیکوریشن تکمیل کو پہنچی۔

بنگلے کی افتتاحی تقریب کا اعلیٰ پیمانے پر اہتمام کیا گیا۔ جس میں میں بھی مدعو تھا۔

میں ایک خوبصورت تحفے کے ساتھ تقریب میں پہنچا۔ مہمانوں میں شہر کی قد آور سیاسی و سماجی شخصیتیں، نامور تاجر، اعلیٰ صنعت کار اور بڑے بڑے سرمایہ دار شامل تھے۔

مسز اشرف نے گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ وہ بےحد خوش اور ہشاش بشاش نظر آرہی تھیں۔

میں نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے تحفہ اُن کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

شکریہ ادا کرتے ہوئے مسز اشرف نے مجھ سے اپنے شوہر کا تعارف کرایا ــــــ

"آپ سے ملئے، آپ ہیں میرے شوہر اشرف شیخ۔"

میں نے مصافحہ کے لئے اشرف کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا جن سے پہلی بار میری ملاقات ہو رہی تھی۔

"اور آپ ہیں شہزاد ڈیکوریشن کے مالک اور انٹیریر ڈیزائنر مسٹر شہزاد۔"

اشرف شیخ نے مصافحہ کرتے ہوئے بڑی گرم جوشی دکھائی۔

"آپ نے کمال کر دیا مسٹر شہزاد! بہت خوبصورت ڈیکوریشن کی ہے آپ نے ہمارے بنگلے کی۔"

"ذرہ نوازی ہے آپ کی!" ___ مَیں نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

دورانِ گفتگو مَیں عجیب سی نگاہوں سے اشرف شیخ کو دیکھے جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر بد ہیکل شخص مسز اشرف کا شوہر ہو سکتا ہے۔ سیاہ رنگت، سر کا اگلا حصہ بالوں سے بے نیاز۔ بڑی بڑی ملگجی آنکھیں، لمبی بھیکی ہوئی ناک، دانتوں کا چوکھٹا منہ سے باہر جھانکتا ہوا اور مضبوط جبڑے۔ اُس کے طویل القامت جسم پر عمدہ تراش کا قیمتی اور نفیس سوٹ تھا جو کسی پہلو سے اُس کی شکل وصورت اور جسمانی ہیئت سے ہم آہنگ نہ تھا۔

مَیں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے معنی خیز انداز سے مسز اشرف کی طرف دیکھا۔ میرے اس اندازِ نگاہ سے اُن کا چہرہ تمتما اٹھا اور آنکھوں کے ڈورے سُرخ ہوتے چلے گئے۔ وہ سرعت سے کسی دوسرے مہمان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اُن میں مجھ سے آنکھیں ملانے کی جرأت ہی کہاں رہی تھی۔ میری نظریں مسز اشرف کی ذات کے نہاں خانے میں پوشیدہ اس ویران کھنڈر تک پہنچ چکی تھیں جس کی آرائش وزیبائش کرتے کرتے خود مسز اشرف اس کھنڈر کا ایک شکستہ قوس بن کر رہ گئی تھیں۔

غبارِ کائنات میں گُم اک وجود

لامحدود و بے کراں کائنات۔ وسیع و عریض۔ جہت درجہت زمین۔ گھنے تاریک جنگل۔ لق و دق پُراسرار صحرا۔ بلند و بالا پہاڑیوں کا لامتناہی سِلسلہ۔ اُفق سے اُفق تک پھیلا ہُوا آسمان۔ چاند۔ سُورج۔ ستارے۔ کہکشاں۔ خلائے بسیط اور اپنی رفتار سے گزرتا ہوا وقت جس کے سینے میں ہزاروں لاکھوں صدیاں دفن ہیں اور بطن میں بے حساب و بے اندازہ سال نمو پذیر۔

میں اپنے وجود سے لاعلم اور اپنی ذات سے بے خبر تھا۔
اپنے اردگرد کی ہر شے میرے لئے باعث حیرت و استعجاب تھی۔ رات نمودار ہوتی تو میں خوف کے مارے غاروں میں جا چھپتا تھا اور سورج طلوع ہوتا تو ڈرتے ڈرتے غاروں سے باہر نکل آتا تھا۔ بارش ہوتی تو مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور بجلیوں کے چمکنے سے میں نامعلوم اندیشوں میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ زلزلے رونما ہوتے تو زمین میرے قدموں کے نیچے سے سرکنے لگتی تھی۔ جنگلوں میں آگ بھڑک اٹھتی تو میں اپنی جان بچانے اِدھر اُدھر دیوانہ وار بھاگا پھرتا تھا۔ طوفانوں اور سیلابوں نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ بدلتے ہوئے موسموں کو سمجھنے سے میری عقل قاصر تھی اور روز و شب کا تغیر میری فہم و فراست سے بالاتر تھا۔
میں زمین کی شکل و صورت سے ناواقف تھا۔ اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ زمین کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ اس کا مرکز و محور کہاں ہے۔ وہ محوِ گردش ہے یا ساکت و جامد۔ نگاہ کی حد تک پھیلی ہوئی زمین۔ کہیں نشیب، کہیں فراز۔ کہیں زرخیز۔ کہیں بنجر۔ کہیں آباد۔ کہیں ویران۔ کہیں خشک اور کہیں تر۔۔۔ جنگل کے اندر جنگل۔ گھنے تناور درخت۔ پیچیدہ خاردار جھاڑیاں۔ خودرو پودے۔ پھول۔ پھل۔ پرندے۔ کیڑے مکوڑے۔ جانور۔ گپھائیں۔ دلدل۔۔۔ بلند و بالا پہاڑیاں۔ ایک پہاڑی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے دوسری پہاڑی شروع ہو جاتی ہے۔ سخت چٹانیں۔ وسیع وادیاں۔ گہری گھاٹیاں۔۔۔ طویل و عریض دریا اور اُن سے پھوٹتی ہوئی بے شمار نہریں اور ندیاں۔۔۔ عمیق و بے کنار سمندر۔ زیرِ آب آباد ایک الگ دنیا۔ مختلف انواع بحری حیوان۔ عجیب و غریب

مچھلیاں۔ حیرت انگیز آبی پودے۔ صدف، موتی ــــ لق و دق، پُراسرار صحرا۔ بے آب و گیاہ ریگزار۔ اونچے اونچے ریتیلے ٹیلے۔ صحرائی جانور۔

میں وسیع و عریض جنگلات کے بیچ گھرا ہوا تھا۔ اونچی اونچی پہاڑی چوٹیوں کے آگے میں نہایت پست قد اور بونا دکھائی دیتا تھا۔ سمندر کو دیکھ کر مجھ پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی تھی۔ اور صحرا کی وسعت و ویرانی میرے لئے موجب پریشانی تھی۔

زمانہ کروٹ بدلتا ہے۔ لاعلمی اور بے خبری کا مہیب اندھیرا چھٹنے لگتا ہے۔ حیرت و خوف کا دبیز دھواں صاف ہونے لگتا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو اور اپنے اطراف و اکناف کی چیزوں کو سمجھنے اور پہچاننے کی جستجو کرتا ہوں۔

زمین میری توجہ کا اہم مرکز تھی اور میری ساری سرگرمیوں کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا ہوں۔ مجھے کسی ایک جگہ استقرار نہیں ملتا ہے۔ میں متواتر مقامات بدلتا رہتا ہوں۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میں جہاں سے نکلتا ہوں وہیں لوٹ کر آجاتا ہوں۔ زمین کی وسعت اور پھیلاؤ کے آگے میری پیش قدمی نہایت معمولی ثابت ہوتی ہے۔

میں جنگل میں جائیں بنا لیتا ہوں۔ لیکن کبھی جنگل کی آگ انہیں جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور کبھی تیز و تند ہوائیں انہیں اکھاڑ پھینکتی ہیں۔ ایک گپھا سے نکلتا ہوں تو دوسری گپھا میں محصور ہو جاتا ہوں۔ ایک دلدل سے باہر نکلتا ہوں تو دوسری دلدل میں گرفتار ہو جاتا ہوں۔ درندے بار بار مجھ پر حملہ آور ہوتے ہیں اور میں اپنے بچاؤ کے لئے خود کو تیر و کمان سے لیس

کرلیتا ہوں۔ ایک زمانے تک میں جنگل کے ماحول میں قید رہتا ہوں۔

بلند و بالا پہاڑی چوٹیاں مجھے مہم جوئی کی ترغیب دیتی ہیں۔ اور میں اونچی اونچی چوٹیاں سر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک چوٹی سر کرتا ہوں تو دوسری چوٹی درمیان میں حائل ہو جاتی ہے۔ بار ہا گہری کھائیوں میں جا گرتا ہوں۔ سالہا سال تک پہاڑی چوٹیوں پر میری چڑھائی جاری رہتی ہے۔

سمندر مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سمندر کی موجیں کبھی مجھے تہہ میں ڈبو دیتی ہیں اور کبھی سطح آب پر لے آتی ہیں۔ کوئی موج مجھے بہالے جاتی ہے تو کوئی کنارے پر اچھال دیتی ہے۔ موجوں کی مدد سے میں نامعلوم جزیروں میں پہنچ جاتا ہوں۔ اور ہزار ہا برس ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے بھٹکتا پھرتا ہوں۔

میں لق و دق صحرا کی خاک چھاننے کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ اور جب ریگستانی طوفان اٹھتے ہیں تو لاکھوں من ریت کے نیچے دفن ہو جاتا ہوں اور مجھے ریت کے نیچے سے باہر نکلنے میں صدیاں لگ جاتی ہیں۔

میری پیش قدمی زمانے کے تغیرات سے ہم آہنگ ہوتی جاتی ہے۔ میں مٹی کے اوصاف سے آشنا ہوتا ہوں۔ پتھر کے مزاج کو سمجھتا ہوں۔ پانی کی خصوصیات سے واقفیت ہوتی ہے۔ آگ کی حقیقت کا علم ہوتا ہے۔ ہوا کی تاثیر معلوم ہوتی ہے۔ پیڑ، پھل اور پھولوں سے پہچان بڑھتی ہے۔ زمین میں پوشیدہ خزانے کا پتہ لگاتا ہوں۔ آگ اور آب کی قوتوں کو مجتمع کرتا ہوں۔ آب و ہوا کی اہمیت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ موسموں کے اثرات کا جائزہ لیتا ہوں۔

آسمان کو تسخیر کرنے کا پہلا مرحلہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔
اِس اقدام کے بعد میں ان ستاروں اور سیاروں پر اپنی
کمند ڈالتا ہوں جو کرۂ ارض کے ساتھ خلائے بسیط میں معلق
اپنے اپنے مدار میں حرکت پذیر ہیں۔ میری پرواز آسماں کی لامحدود
پہنائیوں کو چھونے لگتی ہے اور میں ان ستاروں اور سیاروں
پر اپنے نقشِ پا چھوڑ آتا ہوں۔

میں سورج کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ سورج، آگ
کا ایک بھیانک الاؤ۔ صدیوں کے غور وفکر اور کاوش کے
بعد میں سورج کی تپتے ہوئے تانبے کی مانند سُرخ سطح پر ایسے اُتر جاتا
ہوں جیسے یہ کوئی برفیلی چٹان ہو۔

سُورج کے بعد کہکشاں میری راہوں میں موتیوں
کی طرح بکھر جاتی ہے اور بے کراں خلا، میری قلابازیوں کی
آماجگاہ بن جاتا ہے۔

میری رفتار روشنی کی رفتار سے بھی آگے نکل
جاتی ہے اور کائنات کی لامحدود و بے کراں وسعتیں
میری دسترس میں آجاتی ہیں۔

تسخیرِ کائنات کا خواب شرمندۂ تعبیر
ہو جاتا ہے

لیکن ہزاروں لاکھوں سال بعد میرا یہ خواب
شکست وریخت سے دوچار ہوتا نظر آتا ہے۔ اور مجھ پر
یہ راز افشاں ہوتا ہے کہ لمحہ بہ لمحہ تغیر و تبدل سے آشنا
کائنات کس کس کے دستِ قدرت میں آنے والی
ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ زمین جس
پر میں پوری طرح قابض ہوں اس زمین کے مقابلے
میں بالشت بھر بھی نہیں ہے جو ابھی میرے قبضہ میں نہیں

وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ میری پیش قدمی جاری رہتی ہے۔ اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ ساری زمین پر میں قابض ہو جاتا ہوں۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک میرا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ جنگلات پر میری اجارہ داری مستحکم ہو جاتی ہے۔ پیڑ، پھول، پھل، چرند، پرند، حشرات، جانور سب میرے دائرہ اختیار میں آجاتے ہیں۔ بلند و ارفع پہاڑی چوٹیاں میرے آگے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ سمندر کی موجوں پر مجھے قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ اور میں لق و دق صحراؤں میں اپنے خیمے گاڑ دیتا ہوں۔

اب میری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں۔ چاند۔ سورج۔ ستارے۔ کہکشاں۔ خلا میری توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔

ابتدا سے ہی مجھے ہواؤں میں اڑنے کا شوق تھا۔ اور میں پرندوں کی تقلید میں اونچے ٹیلوں پر کھڑے ہوا میں اڑنے کی سعی کیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں مجھے بعد مایوسی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ میں ہوا میں اپنا توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہوں اور ہوا کے دوش پر سوار بادلوں کے ہمراہ پرواز کرنے لگتا ہوں۔

چاند ہمیشہ سے میرے لئے جاذبِ نظر رہا تھا۔ اور جب میں پرواز کرنے کے قابل ہو جاتا ہوں تو چاند کی طرف اپنا رخ کرتا ہوں۔ زمین اور چاند کے درمیان ایک طویل اور ناقابلِ عبور فاصلہ حائل تھا۔ اس کے باوجود مجھے اپنی قوتِ پرواز پر مکمل اعتماد تھا۔ اور ایک دن میں تمام توقعات کے برخلاف چاند پر پہنچ جاتا ہوں اور چاند کی روپہلی خاک میرے زیرِ قدم آجاتی ہے۔

آئی ہے ۔ وہ جنگل جس پر میری مکمل اجارہ داری قائم
ہے اُس جنگل کا ایک معمولی سا گوشہ بھی نہیں ہے جس میں ابھی
میرا گزر نہیں ہوا ہے ۔ پہاڑیوں کی ارفع ترین چوٹیاں جو
میرے رُوبرو سرنگوں ہیں ان پہاڑی چوٹیوں کے سامنے ایک
ٹیلے کی بلندی بھی نہیں رکھتی ہیں جن پر میں ابھی نہیں پہنچ سکا
ہوں ۔ وہ سمندر جس کی موجوں پر مجھے قدرت حاصل ہے اس
سمندر کی وسعت و گہرائی کے آگے قطرہ بھر بھی نہیں ہے
جو ابھی میرے قابو میں نہیں آیا ہے ۔ وہ صحرا جس میں میرے
خیمے ایستادہ ہیں اُس صحرا کے سامنے مُشت بھر ریت کے برابر
بھی نہیں ہے جس کی سرحدوں سے میں ابھی ناآشنا ہوں ۔
وہ چاند جو میرے زیرِ قدم ہے اُس چاند کے رُوبرو
آئینہ کے ایک ٹکڑے کی مثال بھی نہیں ہے جو ابھی میری
رسائی سے بالاتر ہے ۔ وہ سورج جو میری ہتھیلی پر روشن ہے
اُس سُورج کے مقابلے میں ایک ہلکی سی چنگاری کی تمازت
بھی نہیں رکھتا ہے جسے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں ہے ۔
وہ کہکشاں جو میری راہوں میں موتیوں کی طرح بکھری ہوئی
ہے اُس کہکشاں کے سامنے مثلِ گردِ راہ بھی نہیں ہے جو میری
ابھی دسترس سے باہر ہے ۔ اور وہ خلا جس میں میں ہزارہا
تماشوں میں مصروف ہوں اُس خلا، کے مقابلے میں
ایک چھوٹے سے میدان کی وسعت بھی نہیں رکھتا ہے جہاں
تک پہنچنے سے میری قوتِ پرواز قاصر ہے ۔
میں اس ناقابلِ تسخیر غبارِ کائنات میں گم ہو جاتا
ہوں ۔

ہوا پر بیٹھا ہوا مہارشی

نصف شب کے قریب اس چھوٹے سے گاؤں
میں خوفناک آگ بھڑک اُٹھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں
کی ساری جھونپڑیاں جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئیں۔
جھونپڑیوں میں بے خبر سوتے ہوئے لوگ جھونپڑیوں کے ساتھ
جل کر راکھ کا حصہ بن گئے۔ اور وہ لوگ جنہیں کسی وجہ سے نیند
نہیں آئی تھی اور جو بیدار تھے کسی طرح جلتی ہوئی جھونپڑیوں
سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن اُن میں سے کسی کا

چہرہ جھلس گیا۔ کسی کا سر زخمی ہو گیا۔ کسی کے ہاتھ پاؤں جل گئے۔ کسی کی آنکھیں چلی گئیں۔ کسی کا بازو کٹ گیا۔ گاؤں کے لوگ پریشان ہو اٹھے اور جلتی ہوئی جھونپڑیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کو بچانے کی تگ و دو کرنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جھونپڑیوں میں کیسے آگ لگی۔ جب سے ہوا پر بیٹھے مہارشی نے پیشین گوئی کی تھی کہ اس علاقہ کا ایک گاؤں جل کر تباہ ہو جائے گا۔ وہ آگ کے استعمال میں انتہائی محتاط ہو گئے تھے۔ ضرورت پر آگ جلاتے اور پھر بجھا دیتے۔ گلی کوچوں اور کھلے مقامات پر آگ جلانے کی سخت ممانعت تھی۔ اور یہاں تک کہ گھروں میں بلا ضرورت آگ محفوظ نہ رکھنے کی گاؤں والوں کو تاکید کر دی گئی تھی۔ اگر کسی جھونپڑی کی چمنی یا روشن دان سے ہلکی سی چنگاری بھی اڑتی دکھائی دیتی تو سارے گاؤں میں واویلا مچ جاتا۔ ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود گاؤں میں آگ کیسے لگی؟ ایک اور حیران کن بات یہ تھی کہ ساری جھونپڑیوں میں ایک ساتھ آگ لگی تھی۔ لوگوں کو سنبھلنے اور آگ بجھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ بھیانک آگ جھونپڑیوں کو آدمیوں سمیت چٹ کر گئی۔

صبح ہوتے ہوتے آتش زدگی کے اس واقعہ کی خبر قرب وجوار کے علاقوں میں پھیل گئی۔ لوگ یہ تصور کر کے خوف و دہشت سے لرز اٹھے کہ اگر یہ آگ اُن کے گھروں میں بھڑک اٹھتی تو اُن کا کیا حشر ہوتا۔ علاقے کے گھبرائے ہوئے لوگ ہوا پر بیٹھے ہوئے مہارشی کے پاس دوڑے پہنچے۔ مہارشی ہوا پر بیٹھا تپسیا میں مستغرق تھا۔ کافی دیر بعد اس نے اپنی سحر انگیز آنکھیں کھولیں اور اپنے سامنے خوف سے کانپتے ہوئے لوگوں کے مجمع کو دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ قلیل وقفے کے بعد پھر وہ اپنی آنکھیں

بھول کر لوگوں سے مخاطب ہوا ______

"میں جانتا ہوں کہ تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ تم سب اس گاؤں کے حادثہ سے خوف زدہ ہو گئے ہو ناکہ کہیں تمہاری بستیوں کا انجام بھی اس گاؤں جیسا نہ ہو۔ گھبراؤ نہیں۔ اب اس علاقے میں آتش زدگی کا کوئی واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ لیکن.........."

مہارشی اپنی آنکھیں بند کر کے خاموش ہو گیا۔ اس کی پُراسرار خاموشی جونک بن کر لوگوں کی شہ رگ سے چمٹ گئی اور ان کا خون چوسنے لگی۔

کچھ دیر بعد اُس نے اپنی گہری آنکھیں کھول کر بات مکمل کی ______

"اس علاقے کا ایک چرواہا ایک ناگہانی بَلا کا شکار ہو جائے گا۔"

مہارشی نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سر کی جنبش سے لوگوں کو چلے جانے کا اشارہ کر کے تپسیا میں منہمک ہو گیا۔

لوگ ایک اور خوف کا اژدھا اپنی گردنوں میں لٹکائے اپنی اپنی بستیوں کو لوٹ آئے۔ علاقے کے چرواہوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ معلوم نہیں یہ بَلا کب کس کے سر آئے۔ چرواہے اپنے مویشیوں کے ساتھ جنگل کی طرف نکلتے تو ایک انجانا سا خوف اُن کے پیچھے لگا رہتا۔ انہیں درختوں، جھاڑیوں، پتوں، بیلوں سے وحشت سی ہونے لگتی اور وہ سہمے سہمے ہوئے رہتے کہ کہیں سے کوئی سایہ نکل کر انہیں دبوچ نہ لیں۔ اپنے ہی مویشیوں میں سے انہیں کسی پر شک ہونے لگتا یا کوئی جانور اُن کی طرف کبھی گھور کر دیکھ لیتا تو وہ اس جانور کو گاؤں میں کسی درخت سے باندھ دیتے اور اس پر کڑی نظر رکھی جاتی کہ کہیں وہ بَلا کی صورت

میں اُن پر نازل نہ ہو جائے۔ وہ سورج غروب ہونے کی بہت پہلے مویشیوں کو ساتھ لے کر جنگل سے گھروں کو لوٹ آتے۔ جنگل جہاں انہیں اپنے گھروں سے زیادہ خوشی اور آزادی حاصل تھی اب وہاں اُنہیں اپنی جان کا خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔

ایک شام اس دُور افتادہ دیہات میں ایک بوڑھیا اپنی جھونپڑی کے سامنے بیٹھی چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ بوڑھیا کو روتے دیکھ کر تمام دیہاتی گھبرائے ہوئے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ بوڑھیا کا لڑکا اپنی بکریوں کے ساتھ جنگل سے نہیں لوٹا تھا۔ دوسرے چرواہے دن ڈھلنے سے پہلے ہی اپنے گھروں کو لوٹ آئے تھے۔ دیہات میں سخت اضطراب پھیل گیا۔ بوڑھیا روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ دیہاتی بوڑھیا کے لڑکے کو ڈھونڈنے کے لئے جنگل کی طرف نکل پڑے۔ بوڑھیا کے بیٹے کا کہیں پتہ چلا اور نہ ہی کہیں بکریاں نظر آئیں۔

ان واقعات نے سارے علاقے میں خوف اور دہشت کے آسیب پھیلا دیئے اور لوگوں نے ان ناگہانی بلاؤں اور آفتوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہوا پر بیٹھے ہوئے مہارشی کی پرستش شروع کر دی جس کے نتیجہ میں بتدریج سکون واطمینان کی فضا ہموار ہونے لگی اور لوگوں کے وجود کو زخمی کرتے ہوئے خوف کا اثر زائل ہونے لگا اور ایک طویل عرصے تک اس علاقے میں کوئی ناگہانی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ اور اس دوران مہارشی نے بھی کسی حادثہ کی پیشین گوئی نہیں کی تھی۔

ایک صبح اس قصبہ کے بارہ خاندانوں کے افراد اپنے محلے کے کنوئیں کا پانی پینے کے فوراً بعد موت کے منہ میں چلے گئے۔ کنوئیں کا پاک وشفاف میٹھا پانی سم میں تبدیل ہو گیا

تھا۔ کنوئیں سے تلخ و ترش ابخرات اٹھنے لگے جس کی تیز بو سے دماغ پھٹے جا رہے تھے۔ لوگ جلدی سے کنوئیں کے منہ کو ایک مضبوط چٹان سے بند کر کے تو اپر بیٹھے ہوئے مہارشی کے پاس دوڑے پہنچے۔ مہارشی تپسیا میں محو تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے ہاتھ باندھے، سر جھکائے پریشان و مغموم کھڑے لوگوں کو دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مختصر سے وقفے کے بعد پھر اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر لوگوں سے کہا ——

"اس کنوئیں کی طرح تمہارے قصبے کے سارے کنوؤں کا پانی سم میں تبدیل ہو جائے گا اور تم پانچ دہانیوں تک ان کنوؤں کا پانی استعمال نہیں کر سکو گے۔ پانچ دہائیوں کے بعد سم کا اثر زائل ہونے لگے گا اور کنوؤں کا پانی استعمال کے قابل ہو گا۔"

مہارشی نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور بائیں ہاتھ کی انگلی سے لوگوں کو چلے جانے کا اشارہ کر کے پھر تپسیا میں غرق ہو گیا۔

مہارشی کے کہنے کے مطابق اس قصبے کے سارے کنوؤں کا پانی سم میں تبدیل ہو گیا۔ قصبے کے لوگوں کو محسوس ہوا جیسے وہ ایک لق و دق صحرا میں آ گئے ہیں۔ جہاں چشمے تو موجود ہیں لیکن اُن میں پانی کے بجائے گرم گرم ریت بھری ہوئی ہے۔ اس قصبے سے کوئی ندی یا نہر نہیں گزرتی تھی۔ پیاس کے شدید احساس سے لوگوں کے حلقوم میں سوکھے نوکدار کانٹے اُگ آئے تھے۔ قصبے کے لوگ پانی کے حصول کے لئے اپنی بگھیوں اور جانوروں کو لے کر دور دراز کے علاقوں کی طرف چل پڑے اور سخت دشواریوں اور تکلیفوں سے پانی حاصل

کرتے رہے۔
اسی دوران پہاڑی کے دامن میں واقع بستی میں پڑوس کے قریہ کے جانور گھس آئے اور مقامی جانوروں پر ٹوٹ پڑے۔ مقامی اور بیرونی جانوروں میں شدید خوں ریز لڑائی چھڑ گئی۔ اور بستی میں سخت افراتفری اور انتشار پھیل گیا۔ بستی کے لوگوں کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی تھی۔ لڑائی روز بروز زور پکڑنے لگی اور اس لڑائی میں بے شمار جانوروں اور انسانوں کی جانیں تلف ہو گئیں۔ جانور گھروں میں گھس آئے تھے۔ لوگ حواس باختہ ہو کر قریب کی پہاڑی پر چڑھ گئے تھے۔ پہاڑی کے باسیوں نے بستی کے لوگوں کو اپنے گھروں میں پناہ دی اور کئی عارضی جھونپڑیاں بنا کر ان کے رہنے کا انتظام کیا۔ لوگوں نے غاروں کے اندر۔ درختوں کے نیچے اور چٹانوں کے سائے میں رہنے کا بند و بست کر لیا۔ پہاڑی کے باسیوں نے اپنے پاس جو کچھ بھی کھانے پینے کی چیزیں میسر تھیں بستی کے لوگوں کو فراہم کیں۔ پہاڑی کے باسی خود بھی اناج کے لئے اس بستی پر انحصار کرتے تھے جس کے لوگ اب ان کے یہاں پناہ گزیں تھے۔ جانوروں نے بستی کی ساری فصلوں کو خاک میں ملا دیا تھا اور خوراک کی زبردست قلت پیدا ہو گئی تھی۔ بستی کے لوگ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں پہاڑی پر رہنے لگے۔ بستی میں جانوروں کی خوفناک لڑائی جاری تھی۔

اس سارے علاقے کی فضا ایک بار پھر مکدر ہو گئی اور چاروں طرف خوف و ہراس کے بھیانک بگولے اٹھنے لگے۔ وہ نہایت ہی سنجیدگی سے ان سارے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس پورے علاقے میں پھیلی ہوئی غیر یقینی صورتِ حال سے اُسے بے حد تشویش لاحق تھی۔ متواتر رونما ہونے والے واقعات نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جب بھی ہوا پر بیٹھے

ہونے مہارشی کے متعلق سوچتا اس کے دل و دماغ میں عجیب سے خیالات سر اٹھاتے۔ آج بھی وہ مہارشی کے بارے میں سوچتا ہوا پہاڑی سے نیچے اتر آیا اور مہارشی کی طرف چلنے لگا۔ ایک عجیب احساس اور جذبے سے اس کے سارے بدن کا خون جوش کھا رہا تھا۔ وہ مہارشی کے پاس پہنچا۔ مہارشی حسبِ معمول ہوا پر بیٹھا تپسیا میں مستغرق تھا۔ وہ مہارشی کے رُوبرو جا کھڑا ہوا اور مہارشی کے آنکھیں کھولنے کا انتظار کئے بغیر اس پر چیخ اٹھا——

"جب تم ہمارے علاقے میں رُونما ہونے والے واقعات کی پہلے سے خبر رکھتے ہو تو پھر تم اپنی شکتی اور قوت سے ان حادثات اور بلاؤں کو کیوں نہیں روکتے؟ ہم تمہاری پرستش کرتے ہیں۔ تمہارا احترام کرتے ہیں۔ لیکن تم—— تم بے رحم ہو—— سنگ دل ہو—— ظالم ہو!"

مہارشی آنکھیں بند کئے اس کی باتیں سنتا رہا۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ کسی نے اس کے رُوبرو کھڑے ہو کر اس سے سوال کرنے کی جرأت کی تھی۔ مہارشی کا چہرہ غضبناک ہو گیا۔ اس کے سارے وجود میں زلزلہ سا پیدا ہو گیا۔ اور اس کی قہر آلود آنکھوں سے چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ وہ مہارشی کی اس حالت کو دیکھ کر دہشت کے مارے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور پہاڑی پر آکر خود کو اپنی جھونپڑی میں بند کر لیا۔

اسی روز مہارشی نے پیشین گوئی کر دی کہ پہاڑی پر رہنے والے ایک نوجوان کی سانپ کے کاٹنے سے موت واقع ہو گی۔

اندھیرا چھانے لگا تھا۔ مہارشی کی اس پیشین گوئی سے پہاڑی پر بسے ہونے لوگوں کے دل لرز اٹھے۔ وہ پہلے ہی

میں بھوتوں اور بلاؤں کا شکار تھے۔ انہوں نے مشعلیں جلا کر ساری پہاڑی پر اجالا کر دیا کہ کہیں کوئی سانپ ان کی نظروں سے بچ کر حملہ نہ کر دے۔ وہ ہاتھوں میں مشعلیں اور لاٹھیاں لئے بھاگتے رہے۔ اتنے میں پہاڑی کی بلندی سے ایک وحشتناک انسانی چیخ ابھری۔ اس انسانی چیخ کو سن کر لوگوں کی سانسیں اسی دم رک گئیں اور ہر شخص یہ محسوس کرنے لگا کہ اسے سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑے اپنے ارد گرد دیکھنے لگے۔ پھر لوگ فوراً لاٹھیاں اٹھائے آواز کی سمت بھاگے۔ بلندی پر واقع ایک بند جھونپڑی میں ایک شخص بری طرح کراہ رہا تھا۔ لوگ احتیاط سے جھونپڑی کے اندر داخل ہوئے۔ جھونپڑی میں ایک نوجوان بے بسی کے عالم میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کا سارا بدن نیلا پڑ گیا تھا منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور آنکھیں پھر گئی تھیں۔ لوگ جھونپڑی کے اندر اور باہر سانپ کو ڈھونڈنے لگے۔ لیکن کہیں بھی سانپ کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔ وہیں ایک مارگیر بھی موجود تھا۔ اس نے اپنی بین بجانا شروع کی تاکہ چھپا ہوا سانپ باہر نکل آئے۔ نوجوان گھٹی گھٹی آواز میں کہہ رہا تھا ———

"تم فضول کیوں سانپ کو ڈھونڈ رہے ہو۔ مجھے سانپ نے نہیں کاٹا ہے۔ مجھے زہر پلایا گیا ہے۔"

بین کی آواز میں لوگ نوجوان کی بات نہ سن سکے۔

اور اس نے انتہائی تکلیف کے عالم میں دم توڑ دیا۔

مارگیر بین بجاتا رہا اور لوگ سانپ کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگے۔

○

ماحول

ہر زمین کا اپنا جغرافیہ، ہر علاقے کی اپنی مختلف آب و ہوا اور ہر قطعہ کا اپنا علیحدہ ماحول ہوتا ہے۔

یہ سرزمین بھی اپنے جغرافیہ، اپنی آب و ہوا اور اپنے ماحول کے اعتبار سے دوسری زمینوں، علاقوں اور قطعوں سے جداگانہ تھی۔ یہ سرزمین وسیع و عریض ریگستانوں پر مشتمل تھی۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک لق و دق ریگستان پھیلے ہوئے تھے اور تاحدِ نگاہ ریت ہی ریت دکھائی

دیتی تھی۔ اُس کے طول وعرض میں ریتلے پہاڑوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ یہ پہاڑ اُونچے ضرور تھے لیکن دُور آسمان میں اُڑتے ہوئے بادلوں کو روک نہیں سکتے تھے اور بادل ان پہاڑوں کے سروں پر سے گزر جاتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان پہاڑوں کے دامن سے نہ دریا بہتے تھے اور نہ نہریں۔ اور خود یہ پہاڑ ننگے اور بے آب وگیاہ تھے۔ یہاں بارش بالکل ہی نہیں ہوتی تھی اور اگر کبھی اتفاقاً بارش ہو بھی جاتی تو اُس کے پانی سے ریگستانوں کی اُوپری سطح بھی نم نہیں ہوتی تھی۔ اِدھر بارش ہوتی اور اُدھر اُس کا پانی خشک ریت پر گرتے ہی جذب ہو جاتا تھا۔ یہاں چشموں اور آب گیروں کا نام ونشان تک نہ تھا۔ میلوں کے فاصلے پر کہیں کہیں کنوئیں موجود تھے جن سے ان کنوؤں کے اطراف واکناف آباد باشندے سیراب ہوتے تھے۔ بارشوں کے فقدان اور ندیوں اور نہروں کے عدم وجود کے باعث یہاں کی زمین کاشت کاری اور زراعت کے قابل نہیں تھی یہاں نہ باغات تھے اور نہ جنگلات۔ دُور دُور تک پیڑ پودوں کا وجود نظر نہ آتا تھا۔ البتہ سمندر کے ساحل سے قریب واقع علاقوں میں اُونچے اُونچے درخت دکھائی دیتے تھے۔ ان درختوں کو دیکھ کر بے حد حیرانی ہوتی تھی کہ اتنی خشک ویران اور بے آب زمین پر یہ درخت کیسے زندہ ہیں۔ یہ درخت اس سرزمین کے واحد درخت تھے۔ ان کے ثمر شہد کی طرح شیریں اور لذیز تھے۔ ان درختوں کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ انتہائی شدید گرمی میں ان میں ثمر نشوونما پاتے تھے اور پک کر تیار ہوتے تھے۔ دھوپ کی تپش جس قدر شدت اختیار کرتی اسی قدر ان میں حلاوت اور لذت در آتی تھی۔ دیکھا گیا ہے کہ گرمی کی شدت میں کمی واقع ہونے سے یہ ثمر پوری طرح نشوونما نہیں پاتے تھے اور ناپختہ رہ جاتے تھے

اور ان کی لذت بھی متاثر ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ان درختوں کے ثمر اس سرزمین کے باشندوں کی اولین غذا تھی اور ان درختوں نے ہی چلچلاتی دھوپ میں اُن کے سروں پر سایہ کیا تھا۔

اس سرزمین کے باشندے مضبوط جسم، حساس جگر اور ذہن رسا کے مالک تھے۔ اُن کا طرزِ حیات اپنے ماحول، اپنی آب و ہوا اور اپنے جغرافیے سے مکمل مطابقت رکھتا تھا۔ ان بے آب و گیاہ اور لق و دق ریگستانوں میں روز و شب بسر کرنا کتنا دشوار اور پریشان کن تھا اس کا اندازہ کرنا بے حد مشکل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ریگستان ہی اُن کی زندگی کی کشمکش کا مرکز تھے۔

اس سرزمین کے موسم نہایت ہی غیر متوازن اور انتہائی شدید تھے۔ موسم سرما میں درجہ حرارت صفر سے نیچے گر جاتا تھا اور شدید سردی پڑتی تھی۔ ہر چیز برف ہو جاتی تھی۔ تمام علاقہ نیم تاریک اور کہر آلود ہو جاتا تھا۔ یخ بستہ ہوا کے تیز جھونکے آب دار نیزوں کا سا اثر رکھتے تھے جو جسم میں پیوست ہو کر ہڈیوں کو چھیدنے لگتے۔ ساری فضا سخت سردی سے کپکپانے لگتی تھی۔

موسم گرما میں سورج سوا نیزے پر آجاتا تھا اور سورج کی تیز شعاعیں تالو سے گزر کر سیدھی حلق میں اُتر جاتی تھیں۔ آسمان سے شعلے برسنے لگتے تھے اور ریتیلی زمین آگ کے ایک الاؤ میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ گرم لُو کے جھکڑ اور گرد و غبار کے اُٹھتے ہوئے بگولے ساری فضا کو ناقابلِ برداشت بنا دیتے تھے۔ ماحول پر حبس اور ہُو کا سا عالم مسلط ہو جاتا تھا۔

قابلِ توجہ پہلو یہ تھا کہ اس سرزمین کے باشندے نہ شدید سردی سے خوف زدہ تھے اور نہ تیز گرمی سے گھبراتے تھے۔ وہ تو ان موسموں کی سختی اور شدید اثرات سے راہِ فرار

اختیار کرنے کی بجائے اُن کے ساتھ جینے کا حوصلہ اور ہمت رکھتے تھے۔ ریگستانوں کی دشواریوں اور دقتوں پر انہیں قابو حاصل تھا۔ دراصل انہوں نے ریگستان کو ریگستان سمجھا ہی نہیں تھا۔ نہ گہری ریت اُن کے پاؤں کی زنجیر بن سکی۔ نہ پانی کی قلت اور کمی اُن کے لئے موجبِ اضطراب تھی۔ نہ چلچلاتی دھوپ اور شدید گرمی سے وہ نالاں تھے۔ نہ موسم سرما کی سختی ان کے لئے پریشانی کا باعث تھی۔ نہ غیر زرخیز اور ویران زمینوں سے وہ مایوس اور نا امید تھے۔ ان ریگستانوں میں انہیں جو کچھ میسر تھا وہ اس سے مطمئن اور آسودہ حال تھے۔

لیکن ایک زمانہ ایسا آتا ہے کہ یہاں کے باشندوں کی موجودہ نسل اپنی آب و ہوا اور اپنے ماحول سے بیزارگی اور بدظنی کا اظہار کرنے لگتی ہے۔ اُن کی رائے میں اُن کی سرزمین انسانوں کے آباد ہونے کے قابل ہی نہیں ہے۔ اُن کی بیزارگی اور بدظنی کا سبب یہ تھا کہ وہ نئے نئے علاقوں سے واقف ہو چکے تھے جو اُن کی سرزمین سے بالکل مختلف تھے اور جن سے وہ بیحد مرعوب اور متاثر تھے۔ یہ علاقے قدرتی حسن و جاذبیت سے مالا مال تھے۔ یہاں کی زرخیز زمینیں کھیت اور باغات سے لہلہاتی تھیں۔ یہاں بڑے بڑے دریا ٹھاٹھیں مارتے تھے اور جگہ جگہ نہریں اور ندیاں بہتی تھیں۔ یہاں گھنے جنگلات برف پوش پہاڑیاں اور سرسبز و شاداب وادیاں تھیں۔ یہاں موسلادھار بارش ہوتی تھی۔ اور یہاں کے موسموں میں ایک خوب صورت ہم آہنگی اور دلکشی تھی۔ یہاں کی آب و ہوا معطر اور فضائیں رنگین و کیف آور تھیں۔

اُن کے خیال میں اُن کے آبا و اجداد نے ان چٹیل ریگستانوں میں بدترین دن گزارے ہیں اور وہ اس قسم کے حالات

کو برداشت کرنے کے لئے قطعی تیار نہیں تھے۔ اور وہ اس حقیقت پر شرمندگی محسوس کرتے تھے کہ وہ ایک ایسی سرزمین پر پیدا ہوئے ہیں جو ایک ویران ریگستان ہے۔ وہ یہاں کے ماحول اور آب و ہوا کو پوری طرح بدل دینا چاہتے تھے اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ انہوں نے ایسے عہد میں آنکھیں کھولی تھیں جہاں کوئی شے ناممکن نہیں تھی۔ پتھر پہ پھول کھلایا جاسکتا تھا۔ پانی میں آگ لگائی جا سکتی تھی۔ زہر کو تریاق بنایا جاسکتا تھا۔ اور پھر ان کے پیشِ نظر تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا تھی۔ ایک ایسی دنیا جو سب کچھ بدل دینے پر آمادہ نظر آتی تھی۔ یہاں کوئی شے اپنی شکل و ہیئت میں قائم نہیں تھی۔ نہ زمین، نہ آسمان، نہ جنگل، نہ سمندر اور نہ صحرا۔ جنگلات کو شہروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ سمندروں کا رُخ موڑ دیا گیا تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر راستے بنا دیئے گئے تھے۔ حتیٰ کہ یہاں پانی کا رنگ بدل گیا تھا۔ دھوپ کی تاثیر بدل گئی تھی۔ ہوا کا مزاج بدل گیا تھا۔ اور پھر وہ کیوں نہ اپنی سرزمین کو بدل ڈالنے کا ارادہ کرتے۔ ایک ایسی سرزمین جو صرف ریت ہی ریت تھی۔

انہوں نے سب سے پہلے آب پاشی پر اپنی توجہ مرکوز کی اور پانی کی فراہمی کے نظام کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ مصنوعی دریا نکالے گئے اور نہروں اور ندیوں کا ایک جال بچھایا گیا۔ شجرکاری کے عمل کو تیز کر دیا گیا۔ اور دُور دراز کے علاقوں سے انواع و اقسام کے پیڑ اور پودے لاکر لگائے گئے۔ جگہ جگہ خوبصورت باغات سجائے گئے اور اُن کی نشو و نما میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ قلیل عرصے میں پیڑ پودوں کی ایک کثیر تعداد وجود میں آگئی اور ہر طرف اُونچے اُونچے سایہ دار درخت اور سر سبز و

شاداب پودے دکھائی دینے لگے۔ ان درختوں اور پودوں کی وجہ سے آب وہوا پر گہرے اثرات مرتب ہونے لگے اور ماحول میں بتدریج تبدیلی آنے لگی۔ اور پھر آب وہوا اس قدر بدلتی چلی گئی کہ جو سرزمین بارش کے موسم سے یکسر محروم تھی اب وہاں باقاعدگی سے بارش ہونے لگی۔ بارشوں کے سبب ریتیلے پہاڑوں کے دامن سے دریا بہہ نکلے اور ننگے پہاڑوں نے سرسبز وادیوں کی صورت اختیار کرلی۔ ریتیلی مٹی کے سینے میں زرخیزیاں اُترتی چلی گئیں اور موسموں کے اعتبار سے الگ الگ

فصلیں اُگائی جانے لگیں۔ ریتیلے میدانوں میں سبزے کی چادر سی بچھ گئی۔ فضاؤں میں رنگینی اور آب وہوا میں خوشبوئیں تحلیل ہوتی چلی گئیں۔ قدرتی مناظر سے بانجھ سرزمین قدرتی حسن وجمال کی آماجگاہ بن گئی۔ جو سرزمین دُنیا کے نقشہ پر ایک ریگستان نظر آتی تھی اب وہ ایک گلستان میں تبدیل ہوگئی تھی۔ غرض کہ موجودہ نسل نے اپنی سرزمین کے جغرافیہ، آب وہوا اور ماحول کو ہی بدل ڈالا تھا۔

اس تبدیلی اور تغیر کے پس منظر میں ایک بات قابلِ غور تھی اور وہ یہ کہ موجودہ نسل کی اولادیں جسمانی اعتبار سے نحیف جذباتی پہلو سے بے حس اور ذہنی حیثیت سے ژولیدگی کا شکار پیدا ہونے لگیں۔ اور وہ درخت جو اس سرزمین کے واحد درخت تھے اور جن کی شاخوں پر انتہائی شدید گرمی میں ثمر نشوونما پاتے تھے غیر محسوس طور پر نابود ہوتے چلے گئے۔

جسم + جسم = ؟

رات شباب پر ہے۔ خواب گاہ میں ہلکی سی سُرخ
روشنی پھیلی ہوئی ہے۔
ہم دونوں بستر پر دراز ہیں اور ایک دُوسرے کو محسوس
کرنے، ایک دوسرے میں شریک ہونے اور ایک دُوسرے
کو قبول کرنے کے عمل میں مشغول ہیں۔
وہ میرے ہونٹوں پر ظہور پذیر ہوتی ہے اور مَیں اُس
کے ہونٹوں پر نمودار ہوتا ہوں۔ وہ میرے ہونٹوں سے ٹھوڑی پر

پہنچتی ہے اور ٹھوڑی سے نکل کر گلے کے ذریعہ سینے پر آتی ہے۔ میں اُس کے لبوں سے اُٹھ کر ستواں ناک کو چھوتا ہوا پیشانی پر طلوع ہوتا ہوں۔ وہ میرے سینے سے پرواز کرتی ہوئی پھر ہونٹوں پر آبیٹھتی ہے اور میں اس کی پیشانی سے ہوتا ہوا رخساروں پر پھیل جاتا ہوں اور رخساروں سے آگے بڑھتا ہوا پھر لبوں پر عیاں ہوتا ہوں۔ وہ میرے ہونٹوں سے اُٹھتی ہے اور رخساروں کو چھوتی ہوئی شانوں پر استراحت پذیر ہوتی ہے۔ میں اُس کے لبوں سے گردن پر سرکتا ہوا زلفوں میں روپوش ہو جاتا ہوں اور پھر زلفوں سے طلوع ہو کر شانوں کے ذریعے ہاتھوں کی انگلیوں کو جا چھوتا ہوں اور ہاتھوں کی انگلیوں سے نکلتا ہوا پیروں پر آکر تلوؤں کو گُدگُداتا ہوں وہ میرے شانوں سے ہوتی ہوئی سینے پر اپنا سر رکھ دیتی ہے اور سینے سے دل میں اتر کر جسم کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو جاتی ہے۔ میں اُس کی پلکوں پر جا بیٹھتا ہوں اور پلکوں سے آنکھوں میں اُتر کر جسم کی اتاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہوں۔ ہمارے جسم تپنے لگتے ہیں اور جسموں کی گرمی سے سارا کمرہ جلنے لگتا ہے۔ عین اُس وقت جب ہمارے جسم ایک دوسرے میں تحلیل ہونے لگتے ہیں ایک زوردار برق چمکتی ہے اور لمحہ بھر کے لئے ساری کائنات رنگ و نور میں نہا جاتی ہے۔ اور پھر ایک سکوت سا طاری ہو جاتا ہے۔ ایک سناٹا سا پھیل جاتا ہے۔ ایک خاموشی سی چھا جاتی ہے۔

دفعتاً میں دیکھتا ہوں کہ وہ میرے پہلو میں نہیں ہے۔

میں گھبرا کر بستر سے اُٹھ بیٹھتا ہوں۔

وہ کہاں چلی گئی؟

میں بستر سے اُٹھ کر باورچی خانے میں چلا آتا ہوں اور بتی روشن کر کے اُسے تلاش کرتا ہوں۔ غسل خانہ میں آواز دیتا ہوں۔ اور

جب غسل خانے سے بھی جواب نہیں آتا ہے تو آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر دیکھتا ہوں۔ وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی ہے۔ میری پریشانی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔

ہو سکتا ہے وہ میری ماں کے کمرے میں سو گئی ہو۔ وہ اکثر راتوں میں چپکے سے میرے بستر سے اُٹھ کر ماں کے پاس جا کر سو جاتی ہے۔

مَیں ماں کے کمرے کا دروازہ کھولتا ہوں اور بتی جلا کر اندر تلاشی لیتا ہوں۔ کمرے میں اکیلی ماں جس کا وجود محض چند ہڈیوں پر مشتمل ہے کروٹیں بدل بدل کر سونے کی ناکام کوششیں کر رہی ہے۔ ہم لوگوں کو سنبھالتے سنبھالتے وہ تھک گئی تھی۔ گو کہ فیملی کے ہر فرد نے اپنا اپنا گھر بسا لیا تھا لیکن ابھی بھی اُسے

ہماری ہی فکر لاحق تھی۔ عمر کے اس حصہ میں جہاں بدن کا گوشت ہڈیوں سے چھوٹنے لگتا ہے اور ہڈیاں درد کی شدت سے چٹخنے لگتی ہیں وہ ہماری مشکلوں اور مسائل سے غافل نہیں تھی۔ اتنی رات گئے ماں کو جگا کر پوچھنا مناسب نہیں سمجھتا ہوں اور مایوس مضطرب اپنے خلوت کدہ میں چلا آتا ہوں۔

اکثر ماں سے بھی اس کی اَن بن رہتی ہے اور کبھی کبھی تو تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ماں کی باتیں اور ہدایتیں اُسے اچھی نہیں لگتیں۔ اسے نصیحتوں سے چڑ ہے۔ بندھے ٹکے اصولوں پر چلنا اُسے گوارا نہیں۔ ہر کام اپنے ڈھنگ اور مزاج کے مطابق کرتی ہے۔ دوسروں کی مداخلت برداشت نہیں کرتی۔ یہ بات نہیں کہ وہ ملنسار اور خوش اخلاق نہیں ہے۔ جب ماں سے اُس کا جھگڑا ہو جاتا ہے تو وہ ماں کے کمرے میں جاتی ہے۔ اور اس کے پیر اور سر دابتی ہے اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اُن کے باشعور اور مخلص

ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ اپنے وجود اور اپنی اہمیت کو منوانے پر تلی رہتی ہے اور اس میں جذبۂ مفاہمت کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

ایک روز اس نے خواہش ظاہر کی تھی کہ اس کے لئے سبز رنگ کی ساڑی جس پر گلابی پھول بوٹے ہوں خرید لاؤں۔ غلطی سے میں کچھ دوسرے ہی رنگ کی ساڑی اٹھا لایا تھا۔ اس پر وہ مجھ سے خفا ہوگئی۔ میں بھول گیا تھا کہ اس نے کس رنگ کی ساڑی کی تمنا کی تھی۔ دراصل بعض بہت ہی ضروری باتوں کے درمیان ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں اہم ہوتے ہوئے بھی ذہن سے اتر جاتی ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ میں ساڑی واپس کرکے اسی کی پسند کی لے آؤں۔ اور میں اس بات پر آمادہ نہیں تھا۔ پھر وہ ساڑی اتنی بری بھی نہیں تھی۔ کئی دنوں تک اس نے ساڑی زیب تن نہیں کیا۔ میرے شدید اصرار پر اس نے ایک بار پہن بھی لی تھی۔ اس کے بعد سے آج تک وہ ساڑی صندوق کی زینت بنی ہوئی ہے۔ اس نے صاف لفظوں میں مجھ سے کہدیا تھا کہ میں اپنی پسند و ناپسند کو اس پر مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور یہ سراسر ظلم و ناانصافی ہے۔ میں ایک خود غرض انسان ہوں جسے دوسروں کی خواہشوں، آرزوؤں، تمناؤں کا احساس نہیں ہے میں حسن پرست ضرور ہوں لیکن حسن کو ایک زندہ وجود کی بجائے ایک بے جان شے کی طرح استعمال کرتا ہوں اور جب اپنا غرض پورا ہوجاتا ہے تو منھ پھیر لیتا ہوں اور بے حس و بے مروت ہوجاتا ہوں۔ وہ کسی قیمت پر اپنی شخصیت کو پامال ہونے نہیں دے گی۔ ہر حالت میں اس کا تحفظ کرے گی۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابھی کچھ دن پہلے ہم دونوں میں ناراضگی پیدا ہوگئی تھی۔ مجھے رات کے کھانے میں گیلے سالن اچھے نہیں لگتے

ہیں۔ ایک آدھ روٹی کے ساتھ تھوڑا سا فرائی کیا ہوا گوشت کھانے کا عادی ہوں۔ میں کھانے کے معاملہ میں کافی محتاط واقع ہوا ہوں۔ اور کسی قسم کی غفلت برداشت نہیں کرتا ہوں۔ اُسے اس بات کا اچھی طرح سے علم تھا۔ لیکن اس رات اُس نے اپنی کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوپہر میں بنا ہوا سالن گرم کر کے چاول کے ساتھ میرے سامنے لاکر رکھ دیا تھا۔ حالانکہ ماں نے اُسے تاکید بھی کی تھی کہ وہ میرے لئے رات کا کھانا تیار کرلے۔ لیکن اس نے ماں کی بات سُنی اَن سنی کر دی۔ ہاتھ منہ دھو کر میں کھانے کی میز پر آبیٹھا۔ اور جب کھانے پر میری نظر گئی تو میرے غصہ کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ میرا دل چاہا کہ برتنیں اُٹھا کر اُس کے سر پر دے ماروں۔ بڑی ہی غیر ذمہ دار اور بے سلیقہ عورت ہے۔ کیا اس سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ میرے لئے ایک آدھ روٹی اور تھوڑا سا گوشت فرائی کرلے۔ کیا وہ اتنی کاہل اور تساہل پسند ہوگئی ہے کہ گھر کی اتنی ذمہ داری بھی اس سے سنبھالے نہیں جاتی۔ کیا اسے ذرا بھی میرا خیال نہیں رہتا؟

میں کھانے کی میز سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور بستر پر نیم دراز ہو کر سرہانے سٹول پر رکھی ہوئی کتاب کی بے دلی سے ورق گردانی کرنے لگا۔

وہ مجھے بلانے آئی اور نہ کھانے کے لئے اصرار کیا۔ بیٹھے بیٹھے کھانے کی میز پر سر رکھے سوگئی۔

صبح میں اس سے بات کئے بغیر گھر سے چلا گیا تھا۔ اور جب رات گئے گھر لوٹا تو ماں سے معلوم ہوا کہ وہ میکے چلی گئی ہے۔ یہ بات مجھے بُری لگتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس کے بغیر میری حالت ماہیٔ بے آب سی ہو جاتی ہے۔ میرے اندر عجیب سا اضطراب انگیز ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ایک کشش

ہے جو میرے دل و دماغ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ایک احساس ہے جو میرے اعصاب پر مسلط ہے۔ ایک تشنگی ہے جو میرے وجود کو جلا دیتی ہے۔ میں سخت تنہائی کا شکار ہو جاتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نامکمل اور ادھورا سا ہو گیا ہوں۔ اور میری شخصیت میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ میں اسے میکے سے اپنے گھر لے کر آنا چاہتا تھا۔ لیکن ماں نے مجھے روک دیا تھا۔

"وہ خود سر کے بل چل کر تمہارے پاس آئے گی"۔

شاید میری ماں کی اندر کی عورت سچ بول رہی تھی۔

وہ دوسرے ہی روز میکے سے چلی آئی۔ شاید وہ بھی میرے بغیر تنہا، نامکمل اور ادھوری ہو گئی تھی۔

لیکن آج رات وہ اچانک کہاں چلی گئی؟

میں اضطراب کے عالم میں بالکونی میں آکر کھڑا ہو جاتا ہوں اور باہر کی تازہ ہوا سینے کے اندر اتارنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا سارا جسم پسینے میں تر بتر ہو جاتا ہے جیسے میں کسی سنگلاخ زمین میں گہرا کنواں کھود رہا ہوں۔

رات کا پچھلا پہر ہے۔ میں اپنے بستر پر آکر تقریباً گر پڑتا ہوں۔ اس کی اچانک گمشدگی میرے وجود کو زخمی کر دیتی ہے اور میں فکر کے اندھیروں میں مستغرق ہو جاتا ہوں۔

مجھے خیال آتا ہے۔ ممکن ہے وہ موجود ہو اور میں خود ہی موجود نہ ہوں۔ ممکن ہے آنکھیں ہوتے ہوئے بھی میں دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہوں۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون اپنی حرارت کھو بیٹھا ہو۔ میرا جسم، میرے دست و پا شل اور بے حس ہو گئے ہوں۔ میری توانائی سلب ہو گئی ہو۔ میرے حواس یخ بستہ ہو گئے ہوں۔

معلوم نہیں مجھے کب نیند آجاتی ہے۔

صبح دن کافی چڑھ آتا ہے۔ کوئی مجھے میرے جسم پر سے چادر کھینچ کر جگاتا ہے۔ میں آنکھیں کھول کر دیکھتا ہوں۔ وہ میرے سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ اُسے موجود پاکر مسرت انگیز استعجاب سے میری عجیب سی حالت ہوجاتی ہے۔

"تم رات بھر کہاں تھیں؟"

"چلیے اب اُٹھیے! غسل سے فارغ ہو لیجیے"۔ وہ شرماتے ہوئے لہجے میں کہتی ہے۔

اُس کی بجھی بجھی آنکھوں اور بکھرے بکھرے بالوں سے یہی لگتا ہے کہ وہ رات بھر میرے ساتھ رہی ہے۔

وہ ہاتھ پکڑ کر مجھے بستر سے اُٹھاتی ہے اور میں اُٹھ کر سیدھے غسل خانے میں چلا جاتا ہوں۔

○

دیوار سے جھانکتی سُرخ آنکھ

انہیں علم ہو گیا کہ سُرخ آنکھ اُن کی طرف گھور رہی
ہے اور ساتھ ہی انہیں احساس ہو گیا کہ سُرخ آنکھ چشم زدن میں
اُن کے وجود کو مٹا کر رکھ دے گی۔ سُرخ آنکھ جو انہیں دُور دُور
تک دیکھ سکتی ہے۔ اُن کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتی ہے۔
ان کی زمینوں اور مکانوں کو نشانہ بنا سکتی ہے۔ دریاؤں، کھیتوں،
پہاڑوں کا محاصرہ کر سکتی ہے۔ جو خون کی طرح سُرخ اور آگ
کے شعلوں کی طرح تباہ کن اور دہشت انگیز ہے، اُن کے لئے

مستقل خطرہ بن گئی تھی۔

وہ سُرخ آنکھ کے خوف و قہر سے بچنے کے طریقوں پر غور و خوض کرنے لگے۔ لیکن وہ کسی ایک خیال پر متفق نہ ہو سکے۔ وہ جمع ہوتے اور پھر منتشر ہو جاتے۔ اور اُدھر سُرخ آنکھ کی پیش قدمی جاری تھی۔ بالآخر وہ سب اس خیال پر متفق ہو گئے کہ چاروں گرد دائرہ کی شکل میں ایک وسیع، بلند اور مستحکم دیوار تعمیر کی جائے۔

دیوار کا ایک انتہائی پیچیدہ نقشہ تیار کیا گیا اور معماروں نے دیوار کی تعمیر کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ عورتیں، بچے، بوڑھے بھی اُن میں شامل ہو گئے۔ ایک طرف گہری بنیادوں کی کھدائی کا کام شروع ہو گیا اور دوسری طرف سامانِ تعمیرات اکٹھا کیا جانے لگا۔ پہاڑ کاٹ کاٹ کر پتھر لادا گیا۔ چونے کی بڑی بڑی بھٹیاں جلائی گئیں۔ ریت جمع کی گئی۔ کئی دنوں تک سخت، سنگلاخ اور ناہموار زمین پر بنیادوں کی کھدائی کا کام چلتا رہا۔ تجربہ کار معماروں نے بنیادوں کی کھدائی پر زیادہ توجہ صرف کی کہ بنیادیں جتنی گہری ہوں گی دیوار اتنی ہی مستحکم اور پائیدار ہوگی۔ وہ زلزلوں کی تباہ کاری سے بھی محفوظ رہے گی اور وقت کے ہاتھ بھی اُسے کمزور نہیں کر سکیں گے۔ بنیادوں کی کھدائی میں کئی سال لگ گئے۔ سُرخ آنکھ کا خطرہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا اور وہ جلد سے جلد دیوار کھڑی کر دینا چاہتے تھے۔ لیکن ان پر اس وقت مایوسی چھا گئی جب بنیادوں کی کھدائی کے دَوران راہ میں ایک مضبوط اور قوی چٹان حائل ہو گئی۔ انہوں نے چٹان کو توڑنے کی جان توڑ کوششیں کیں۔ سارے طریقے آزما ڈالے۔ لیکن بے سود۔ چٹان کو توڑنا تو کجا وہ اسے جگہ سے ہلا بھی نہ سکے۔ سُرخ آنکھ کے خوف کا احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔ سُرخ آنکھ برابر اُن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چند بزرگوں نے

رائے پیش کی کہ ایک ہی رنگ کے سات بے عیب جانوروں کی قربانی دی جائے تو چٹان اپنے آپ ٹوٹ جائے گی۔ بزرگوں کی رائے پر عمل کرتے ہوئے ایک ہی رنگ کے سات بے عیب جانور لائے گئے۔

سورج طلوع ہونے سے قبل انہیں ذبح کرکے ان کا تازہ خون چٹانوں پر ٹپکایا گیا۔ اور پھر کئی دنوں تک وہ چٹان کے ٹوٹنے کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن یہ عمل بھی بے اثر ثابت ہوا۔ اُن کی تشویش میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ اب دیوار کی تعمیر مکمل نہیں ہو سکے گی۔ بنیادوں کی کھدائی کا کام التوا میں پڑا رہا۔ مایوسی کے بادل گھنے ہوتے جارہے تھے اور انکی ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔

وہ بزرگ جنہوں نے جانوروں کی قربانی کی رائے دی تھی یہ وضاحت پیش کی کہ چونکہ چٹان صدیوں سے موجود ہے اور اس کی جڑیں گہرائیوں میں پھیل چکی ہیں اس لئے جانوروں کی قربانی ان پر اپنا اثر نہ دکھا سکی۔ ان بزرگوں نے ایک بار پھر رائے پیش کی کہ اگر سات بچوں کو جو ہم نام ہوں اور جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں قربان کیا جائے تو چٹان ٹوٹ سکتی ہے۔ ان کے سامنے ایک بہت بڑا امتحان تھا۔ لیکن وہ اس کے لئے بھی آمادہ ہو گئے۔ سات بچوں کو جو ہم نام تھے اور جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے تلاش کیا۔ سورج طلوع ہونے سے قبل انہیں چٹان کے پاس لایا گیا۔ ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ مائیں شدت غم سے بے حال تھیں۔ سب کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ آہوں اور آنسوؤں کے درمیان سات بچوں کو ذبح کرکے ان کا تازہ خون چٹان پر ٹپکایا گیا۔ اور پھر [illegible]ظار کرنے لگے۔

ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اور کئی دن گزر گئے۔ لیکن چٹان کے ٹوٹنے کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔
اور اُدھر سُرخ آنکھ کی پیش قدمی جاری تھی۔ بنیادوں کی کھدائی کا کام التوا میں پڑا رہا اور دیوار کی تعمیر کے سارے

امکانات معدوم ہوتے نظر آنے لگے۔ اُن کے سامنے سُرخ آنکھ سے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ راست طور پر سُرخ آنکھ کی زد میں تھے۔ دن گزرتے جارہے تھے اور سُرخ آنکھ کا خوف دیمک کی طرح ریزہ ریزہ ان کے وجود کو چاٹ رہا تھا۔
صورتِ حال اس وقت تبدیل ہوئی جب چند سنگ تراشوں نے جو چٹان کو توڑنے کی کوششوں میں پیش پیش تھے چٹان کے اس مقام کا پتہ لگالیا جہاں سے چٹان کو کاٹ کر راہ سے ہٹایا جاسکتا تھا۔ ان کی ہمت ایک دفعہ پھر مجتمع ہوئی۔ چٹان کو توڑنے کے لئے وہ سب اکٹھا ہو گئے۔ بالآخر کئی دنوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد چٹان ٹوٹ گئی۔ لیکن یہ بات ہے کہ وہ چٹان کو زمین سے مکمل طور پر اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ چٹان کی شاخیں ابھی بھی زمین کی گہرائیوں میں پیوست تھیں۔ لیکن انہوں نے چٹان کو کاٹ کر اتنی جگہ ضرور بنالی کہ بنیادوں کی کھدائی کے کام کو آگے بڑھایا جاسکتا تھا۔ ایک بار پھر بنیادوں کی کھدائی کا کام زور وشور سے شروع ہو گیا۔
بنیادوں کی کھدائی کا کام مکمل ہوتے ہی انہیں پتھر، ریتی، چونے سے بھر کر مضبوط کیا گیا اور اُن پر دیوار اُٹھائی جانے لگی۔ انہوں نے اپنی توانائی دیوار کی تعمیر میں لگادی۔ وہ ناقابلِ تسخیر عزم اور حوصلے سے سرشار تھے۔ دیوار ایک ایک بالشت آگے بڑھتی رہی۔ بارش، دھوپ، جاڑا، گرمی کوئی

موسم اُن کے کام میں مانع نہ ہو سکا۔ وہ پوری تیزی اور تندہی سے دیوار کی تعمیر میں سرگرم ہو گئے۔ انہیں انگنت مسائل اور مشکلات کا سامنا تھا جن پر قابو پاکر دیوار کی تعمیر کے کام کو جاری رکھنا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ کام کے دوران کئی معماروں کی جانیں چلی گئیں۔ ایک طرف جاں بحق ہونے والے معماروں کے عظیم الشان مدفن بنائے گئے اور دوسری طرف دیوار کی تعمیر کا کام آگے بڑھتا رہا۔ سُرخ آنکھ کا خوف شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ وہ کندھے سے کندھا ملا کر دیوار کی تعمیر میں لگ گئے۔ دیوار ایک ایک بالشت آگے بڑھتی رہی اور ابھی میلوں آگے بڑھنا تھا۔ اُن کے چہروں پر تھکن اور اضمحلال کے آثار کا شائبہ تک نہ تھا۔ دیوار جیسے جیسے آگے بڑھتی جا رہی تھی وہ ایک نئے جوش اور جذبہ کا مظاہرہ کرتے جا رہے تھے۔ دیوار کا نصف دائرہ مکمل ہو چکا تھا۔ اور بقیہ کام نہایت تیزی اور تندہی سے جاری تھا۔ سُرخ آنکھ اُن کی طرف برابر بڑھتی جا رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دیوار کے مکمل ہونے سے قبل اُن پر اپنا قہر مسلط کر دے گی۔ وہ پوری مستعدی اور جانفشانی سے دیوار کی تعمیر میں منہمک تھے۔ پہاڑ کاٹ کاٹ کر پتھر لادا جا رہا تھا۔ چونے کی بے شمار بھٹیاں جلائی جا رہی تھیں۔ ریتی اکٹھا کی جا رہی تھی۔ ایک ساتھ ہزاروں ہاتھ اور لاکھوں بازو دیوار کی تعمیر میں مصروف تھے۔ اور دن رات کی جانفشانی اور تکلیف دہ محنت اور کوششوں کے بعد دیوار کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ اب وہ ایک وسیع، بلند اور مستحکم دیوار کی پناہ میں تھے اور سُرخ آنکھ اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ یہ دن اُن کی زندگی کا عظیم ترین دن تھا۔

دیوار کی تعمیر پر عظیم الشان جشن کا اہتمام کیا گیا۔ اُن

سات ہم نام بچوں کو جنہیں قربان کیا گیا تھا ان کے مقابر پر عطر کا چھڑکاؤ کیا گیا اور ماؤں نے ان پر گلدستے چڑھائے۔ دیوار کی تعمیر کے دوران جاں بحق ہونے والے معماروں کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ وسیع، بلند اور مستحکم دیوار پر انکے نام طلائی حروف میں منقش کیے گئے۔ نغمہ و رقص کی محفلیں سجائی گئیں۔ جام و صبوح گردش میں آگئے۔ فضائیں خوشبوؤں سے مہک اٹھیں۔ رنگ اور روشنی سے ہر چیز دمک اٹھی۔ وہ فخر و مسرت کے احساس سے جھوم جھوم اٹھے۔ اب وہ سرخ آنکھ

کے خوف و قہر سے محفوظ تھے۔ اور اُن کے اطراف ایک وسیع، بلند اور مستحکم دیوار کھڑی تھی۔ اُن پر برسوں دیوار کی تعمیر کا نشہ چھایا رہا۔ اور پھر وہ اپنے اپنے معاملات میں مشغول ہو گئے۔

وسیع، بلند اور مستحکم دیوار کی سالمیت اس وقت متزلزل ہو گئی جب دیوار کی پناہ میں محفوظ ایک مکان نے راتوں رات دیوار کے ایک حصّہ کو توڑ کر اُس کے پتھروں سے اپنے گرد دیوار اُٹھالی۔ کئی دنوں سے اس مکان کے دروازہ پر کوئی خوفناک دستکیں دے رہا تھا۔ اس مکان کو شبہ ہو گیا کہ یہ دستکیں سرخ آنکھ کی ہیں جو اس کے دروازے تک آپہنچی ہے۔ برسوں سے سویا ہوا خوف اچانک جاگ اُٹھا۔ ایک بار پھر وہ خوف و قہر کی گرفت میں آگئے۔ دوسری رات دوسرے مکان نے اپنے گرد دیوار کھڑی کرلی۔ تیسری رات تیسرے مکان نے اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے مکانات نے اپنے اطراف دیواریں اُٹھالیں۔ کسی مکان کو وسیع، بلند اور مستحکم دیوار کی ضرورت کا احساس نہیں رہ گیا تھا۔ ہر مکان اپنے گرد دیواریں اُٹھانے کی فکر میں تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وسیع، بلند اور مستحکم دیوار ٹوٹ کر بے نشان ہو گئی اور ہر مکان نے اُس کے پتھروں سے اپنے

اپنے گرد ایک الگ دیوار کھڑی کرلی۔

کچھ دنوں بعد مکانات کے گرد کھڑی دیواریں بھی ٹوٹنے لگیں اور ہر فرد اپنے اطراف ایک دیوار اُٹھانے لگا۔

اس عرصے میں ہر فرد ایک سُرخ آنکھ بن گیا تھا۔ اور ایک فرد دوسرے فرد کے وجود کو مٹانے کے درپے تھا۔ مکانات کے گرد کھڑی دیواریں بھی غائب ہوگئیں اور ہر فرد نے اپنے گرد ایک دیوار کھڑی کرلی۔

پھر یوں ہوا کہ ساری دیواریں ڈھ گئیں اور ہر طرف سُرخ آنکھیں چمکنے لگیں!

○

ازل سے تا ابد

اصطبل سے نکل کر میں شہر کی آخری سرحد پر آپہنچتا ہوں۔ یہ سرحد میری رفتار، کشمکش اور جد وجہد کی آخری سرحد ہے۔ مجھ سے پہلے اس سرحد پر ہزاروں لاکھوں قافلے مارے گئے ہیں۔ بعض قافلے شہر کے ہنگاموں اور شور وغل میں کھو گئے۔ بعض روشنیوں اور رنگینیوں میں گم ہو گئے۔ بعض سرحد پر پہنچتے پہنچتے رہ گئے۔ بعض پہلے قدم پر ہی بیٹھ گئے اور بعض اصطبل سے باہر ہی نہیں نکل سکے۔

میں صبح اصطبل سے نکلتا ہوں اور شہر کے مانوس راستوں سے گزرتا ہوا شام تک شہر کی آخری سرحد پر آپہنچتا ہوں اور پھر یہاں سے اصطبل لوٹ آتا ہوں۔ یہ میرا روز کا معمول ہے یا یوں کہئے کہ میں اس عمل کے دائرے میں قید ہوں یا پھر مجھے قید کر دیا گیا ہے یا میں خود قید ہو گیا ہوں۔ میں نے بارہا سوچا کہ شہر کی سرحد کے اس پار نکل جاؤں۔ یہاں کشش ثقل اس قدر شدید ہے کہ اس کے حصار کو توڑنا کسی بھی رخش کی بساط سے بالاتر ہے۔ اس مقام پر رخش کے پیر گھٹنوں تک زمین میں دھنس جاتے ہیں۔

میری نشوونما اصطبل کے محدود اور تنگ ماحول میں ہوئی ہے۔ میں چلنے کے قابل ہوا تو مجھے شہر کے چند متعین محفوظ اور پختہ راستے بتائے گئے جو شہر کی آخری سرحد پر آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ ہم متعین اور محفوظ راستوں پر چلنے کے عادی ہیں۔ اور ہمیں وہی راستے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں جو راست طور پر اصطبلوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں نامعلوم اور غیر ہموار راستوں پر چلنے کی خواہش نہیں ہے کہ ہمیں اپنے اصطبلوں سے بچھڑ جانے کا خوف لاحق ہے اور شام ہوتے ہی ہمیں اپنے اصطبل لوٹ آنا ہے۔ اصطبل کی مضبوط طنابیں ہمارے دل و دماغ اور آنکھوں میں آہنی کھونٹیوں کے ذریعے سختی سے گاڑ دی گئی ہیں ہماری سوچ اصطبل سے آگے نہیں جاتی ہمارے خیالات اصطبل کے اندر چکر لگا کر تھک جاتے ہیں اور ہماری بصارت اصطبل کی چھت اور دیواروں سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہے۔ جب کبھی میں جست لگانا چاہتا ہوں اصطبل کی طنابیں میرے ہاتھ پاؤں اور جسم کو مضبوطی سے باندھ دیتی ہیں اور میں تڑپ تڑپ کر رہ جاتا ہوں۔

آج میں یہ سوچ کر اصطبل سے نکلتا ہوں کہ سرحد کے اس

پار نکل جاؤں۔ مَیں سرحد پر آپہنچتا ہوں اور بے انتہا جد وجہد اور سخت ترین کش مکش کے بعد سرحد کے اُس پار نکل جاتا ہوں۔ ایک زلزلہ سا اُٹھتا ہے۔ زمین جگہ جگہ سے شق ہوجاتی ہے۔ ہر چیز تہ وبالا ہوجاتی ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں مع رخش دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا ہوں اور میرا ایک ٹکڑا سرحد کی اُس جانب اور ایک ٹکڑا سرحد کی اِس جانب جا گرا ہے۔ مَیں جلد ہی رخش کی پیٹھ پر خود کو سنبھال لیتا ہوں اور اُسے اپنے قابو میں کر لیتا ہوں۔

سرحد کی اس جانب غیر مختتم راستے پھیلے ہوئے ہیں۔ مَیں بہت دُور نکل آتا ہوں۔ کسی راستے کی کوئی متعین سمت اور حد نہیں ہے۔ غیر مانوس اور نامعلوم راستے۔ مَیں مسلسل چل رہا ہوں۔

یک بارگی رخش گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتا ہے۔ مَیں فی الفور رخش سے نیچے اُتر آتا ہوں۔ اور اُسے اُٹھ کھڑا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور پھر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی ٹانگوں میں لغزش سی پیدا ہوجاتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اور مَیں پھر اس پر سوار ہوجاتا ہوں۔ میرے سامنے کوئی سرحد نہیں ہے اور نہ ہی مجھے شام ہوتے ہی اصطبل لوٹ آنا ہے۔ سورج کے طلوع ہونے اور غروب ہونے کا عمل جاری ہے اور مَیں مسلسل چل رہا ہوں۔ ایک بار پھر رخش بیٹھ جاتا ہے۔ تشویش کے گہرے سائے مجھے آگھیرتے ہیں۔ اسی اثنا میں مجھے کہیں دُور سے کسی دُوسرے رخش کے ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ٹاپوں کی آواز قریب ہوتی جاتی ہے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ میرے عقب سے ایک رخش میری طرف چلا آرہا ہے۔ وہ میرے پاس آکر رُک جاتا ہے۔ اس پر کوئی سوار

نہیں ہے۔ محض پیٹھ پر زین بندھی ہوئی ہے۔
کیا تم تھک گئے ہو؟ ___ رخش کی پیٹھ سے بندھی زین سے آواز آتی ہے۔
اس سوال پر میں جھنجلا اُٹھتا ہوں اور اس کا جواب پانے کے لئے میں اپنے وجود کے سارے امکانات کو کھنگالنے لگتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے چہرے پر پسینے کی بوندیں اُبھر آئی ہیں۔
اپنے ہاتھ رخش کی ناکارہ ٹانگوں کی جگہ لگا دو ___ یہ کہہ کر وہ رخش آگے بڑھ جاتا ہے۔
میں چونک اُٹھتا ہوں اور اپنے شانوں پر اپنے ہاتھ تلاش کرنے لگتا ہوں۔ تلاش کے بعد مجھے اپنے ہاتھ مل جاتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھوں کو شانوں سے اُوپر اُٹھانے کا ارادہ کرتا ہوں۔ ہاتھ کچھ اُوپر اُٹھ کر رُک جاتے ہیں۔ میں انہیں مزید اُوپر اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرے بازؤں میں ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں آتی ہیں جیسے برف میں منجمد کسی بے جان شے پر دباؤ ڈالا جا رہا ہو۔ ممکن ہے کہ میرے ہاتھ بھی منجمد ہو گئے ہوں۔ یا پھر وہ شانوں سے اُوپر اُٹھے ہی نہ ہوں۔ یا پھر شانوں سے اُوپر اُٹھے بھی ہوں تو اس میں میرا ارادہ شامل نہ رہا ہو۔ میں جیسے جیسے ہاتھوں کو شانوں سے اُوپر اُٹھاتا ہوں ویسے ویسے میرے بازؤں کی ہڈیاں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ میں بہ دقت تمام اپنے ہاتھوں کو شانوں سے اُوپر اُٹھا لیتا ہوں۔ کئی بار انہیں اُوپر نیچے حرکت دیتا ہوں۔ اور پھر انہیں رخش کی اگلی ٹانگوں کی جگہ لگا دیتا ہوں۔
رخش اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور میں سرعت سے اس پر سوار ہو جاتا ہوں۔ رخش پہلے سے زیادہ چاق و چوبند ہو جاتا ہے۔ میں جس طرف مُڑ جاتا ہوں اس طرف ایک نیا راستہ شروع

ہو جاتا ہے۔ کوئی راستہ کسی سرحد پر ختم نہیں ہوتا۔ یہاں تو کوئی سرحد ہی نہیں ہے۔ ہر راستہ افق سے تا افق پھیلا ہوا ہے۔ میں مسلسل چل رہا ہوں۔

اچانک رخش زمین پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کی پچھلی ٹانگیں بے دم ہو کر ٹوٹنے لگتی ہیں۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ چلنے لگتا ہے۔ وہ زیادہ دور چل نہیں سکتا۔ پھر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ میری حالت بھی ٹوٹنے لگتی ہے۔ میں بھی زمین پر بیٹھ جاتا ہوں۔ اسی دوران میں دیکھتا ہوں کہ وہی رخش جس پر کوئی سوار نہیں ہے اور جس کی پیٹھ پر زین بندھی ہوئی ہے میری طرف چلا آرہا ہے۔ وہ میرے پاس آکر ٹھہر جاتا ہے۔

اٹھو اور اپنے پیر رخش کی پچھلی ٹانگوں کی جگہ لگا دو۔

رخش کی پیٹھ سے بندھی زین سے آواز آتی ہے۔

مجھے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ میرے پیر بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے میرے پیر میرے ساتھ رہے ہوں اور میں نے انہیں فراموش کر دیا ہو۔ یا پھر ان کی ضرورت ہی پیش نہ آئی ہو۔ یا پھر وہ میرے علم کے بغیر میرے ہمراہ چلتے رہے ہوں۔ یا پھر وہ جس طرف جاتے ہوں میں اس طرف جاتا نہ ہو۔ یا پھر وہ حرکت کرتے رہے ہوں اور میں ساکت رہا ہو۔

میں اپنے پیر رخش کی پچھلی ٹانگوں کی جگہ لگا دیتا ہوں۔

رخش سرعت سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور میں اس پر سوار ہو جاتا ہوں۔ وسیع و عریض راہیں اور ہر راہ سے پھوٹتی ہوئی بے شمار راہیں۔ کسی راستے کی کوئی متعین سمت اور حد نہیں ہے۔ میں مسلسل چل رہا ہوں۔

دفعتاً رخش رک کر ہنہنانے لگتا ہے۔ اپنی ٹانگیں

اوپر اچھال اچھال کر اور اپنے سر کو اِدھر اُدھر گھما کر متواتر ہنہناتا ہے۔ مَیں اسے لاکھ مہمیز لگاتا ہوں۔ وہ آگے بڑھنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ میرے لئے رخش کی پیٹھ پر جمے رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ ٹانگیں اوپر اچھالتا ہے تو مَیں نیچے آنے لگتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ رخش پر میری گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے۔ اس کشمکش کے عالم میں وہی رخش جس پر کوئی سوار نہیں ہے اور جس کی پیٹھ پر زین بندھی ہوئی ہے مجھے سامنے سے آتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ میرے پاس آکر رُک جاتا ہے۔

رخش اپنی بصارت سے محروم ہو گیا ہے۔ اپنی آنکھیں رخش کو دے دو ـــــ رخش کی پیٹھ سے بندھی زین سے آواز آتی ہے۔

مجھے خیال آتا ہے کہ میری تو آنکھیں ہی نہیں ہیں۔ آنکھوں کی جگہ دو گہرے بے نور حلقے ہیں جن کے ذریعے مَیں دیکھتا ہوں۔ مَیں نے کبھی آنکھوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ہے۔ جو کچھ مجھے دکھایا جا تا رہا ہے مَیں وہی دیکھتا رہا ہوں مَیں نے خود کوئی شے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ مَیں ان بے نور حلقوں میں اپنی آنکھیں تلاش کرنے لگتا ہوں۔ دفعتاً ایک بجلی سی چمک اُٹھتی ہے اور دو روشن آنکھیں اُن بے نور حلقوں کی تاریک گہرائیوں سے آہستہ آہستہ اُبھر آتی ہیں اور مَیں ان روشن آنکھوں کو رخش کی بے بصارت آنکھوں کی جگہ لگا دیتا ہوں۔ رخش ہنہنانا چھوڑ کر مستعدی سے کھڑا ہو جاتا ہے اور مَیں اس پر سوار ہو جاتا ہوں۔ وہ کبھی دائیں مُڑ جاتا ہے اور کبھی بائیں مڑ جاتا ہے۔ اور کبھی دو دو تین تین راستوں کو کاٹتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایک راستے سے ہزار راستے اور ایک موڑ سے لاکھوں موڑ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ مَیں مسلسل چل رہا ہوں۔

یک بیک رخش منہ کے بل اُلٹ جاتا ہے اور میں دُور جا گرتا ہوں۔ رخش کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا ہے اور اس کی یہ حالت دیکھ کر میری نبض بھی ڈوبنے لگتی ہے۔ میں اُٹھ کر بڑی مشکل سے رخش کے پاس آتا ہوں۔ وہ پیر جھاڑنے لگتا ہے اور پیر جھاڑتے جھاڑتے بے حس و حرکت ہو جاتا ہے۔ اس کشمکش کے درمیان مجھے وہی رخش جس پر کوئی سوار نہیں ہے اور جس کی پیٹھ پر زین بندھی ہوئی ہے میری طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ رخش میرے پاس آکر ٹھہر جاتا ہے۔

اپنا لہو رخش کے جسم میں منتقل کر دو ۔۔۔ رخش کی پیٹھ سے بندھی زین سے آواز آتی ہے۔

میری رگوں میں تو لہو کی جگہ سُرخ سیال گردش کر رہا ہے جو جسم کے لق و دق صحرا کو سیراب کرنے کے لئے کافی ہے۔ لہو یا تو مر چکا ہے یا پھر اپنی خصوصیات کھو بیٹھا ہے۔ لہو کے فقدان پر کبھی میرے جسم نے احتجاج نہیں کیا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا رہا ہے کہ میرا جسم اندرونی طور پر بیمار ہوتا جا رہا ہے خصوصًا دل کی ہیئت بدلتی جا رہی ہے۔

بے حس و حرکت رخش کو لہو درکار ہے۔ مجھے کسی طرح اپنے قلب کی تہہ میں لہو کے چند قطرے میسّر آ جاتے ہیں۔ جو قلب میں ابھی تک باقی رہ گئے ہیں۔ میں لہو کے ان قطروں کو رخش کے جسم میں منتقل کر دیتا ہوں۔ رخش پوری قوت سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور میں اس پر سوار ہو جاتا ہوں۔ میں مسلسل چل رہا ہوں۔

چلتے چلتے مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں بتدریج رخش کے وجود کا حصہ بنتا جا رہا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ میں رخش کی پیٹھ میں ضم ہونے لگا ہوں۔

مَیں مکمل طور پر رخش کے وجود کا حصہ بن جاتا ہوں
اور پوری طرح رخش کی پیٹھ میں ضم ہو جاتا ہوں۔ رخش کی پیٹھ
پر محض زین رہ جاتی ہے۔
مَیں مسلسل چل رہا ہوں۔ غیر مختتم راہیں اور ہر راہ
سے پھوٹتی ہوئی بے شمار راہیں۔

○

تارِ عنکبوت

میں ایک جاروب کش ہوں۔ لیکن دوسرے جاروب کشوں کے مقابلے میں میرے کام کی نوعیت کسی قدر مختلف ہے۔ میں صرف مکانات کے اندر دیواروں، چھتوں اور روشن دانوں میں پھیلے ہوئے مکڑی کے جالے صاف کرتا ہوں اور صحنوں، دالانوں اور کمروں میں جمع شدہ کوڑا کرکٹ سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ یہ مالکانِ مکانات کا اندرونی معاملہ ہے کہ وہ اپنے مکانات میں جمع شدہ کوڑا

گرکٹ کو صاف کریں یا نہ کریں۔ کبھی کبھار میں بھی کوڑا کرکٹ کی صفائی میں ہاتھ بٹا دیا کرتا ہوں۔ لیکن میرا اصل کام جالوں کو صاف کرنا ہے اور میں اپنی ساری توجہ جالوں پر صرف کرتا ہوں۔

مکانات کو ایک کالونی کی شکل دے دی گئی ہے۔ کالونی کی صورت اختیار کرنے سے قبل یہ مکانات ایک دوسرے سے بالکل کٹے ہوئے تھے اور ان کے درمیان مختلف قسم کے تعلقات قائم تھے جو اکثر ٹوٹتے اور بنتے رہتے تھے۔ ہر مکان کی اپنی حکمت عملی تھی اور کوئی مکان کسی قانون یا ضابطہ کا پابند نہیں تھا۔ کوئی بھی مکان اپنی مرضی کے مطابق دیوار کھڑی کر کے زمین کو کہیں سے بھی اپنے مکان میں شامل کر لیتا تھا۔ سارے مکانات پر دو چار کی اجارہ داری قائم تھی اور دوسرے افراد اپنے مکانات کے مالک ہوتے ہوئے بھی اپنے مکانوں میں کرایہ داروں کی حیثیت سے رہتے تھے۔ ان مکانات کے درمیان کئی جھگڑوں کے علاوہ دو بڑی خوں ریز لڑائیاں بھی ہو چکی تھیں۔ ان لڑائیوں میں بے حساب جانی و مالی نقصانات ہوئے تھے۔ بے شمار مکانات نذر آتش کر دیئے گئے تھے۔ ہزاروں لاکھوں انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے۔ لاتعداد خاندان بے گھر ہو گئے تھے۔ یہاں کی زمین بھیانک دلدل بن گئی تھی جس میں ساری انسانیت غرق ہوتی چلی گئی تھی۔ ان تباہ کن لڑائیوں کے بعد چند باشعور مکانات نے یہ تجویز پیش کی کہ سارے مکانات کو ایک کالونی کی شکل میں منظم کر دیا جائے اور باہمی مسائل اور تنازعات کو گفت و شنید کے ذریعے طے کیا جائے اور کسی بھی مکان کو کسی دوسرے مکان کے خلاف قوت کے استعمال کا حق نہیں ہوگا۔ کسی بھی مکان کو کسی دوسرے مکان کی زمین پر

قابض ہونے کی اجازت نہیں ہوگی۔ کسی بھی مکان کے اندرونی معاملات میں کسی دوسرے مکان کی دراندازی برداشت نہیں کی جائے گی۔ سارے مکانات کو ایکدوسرے کے حدود کا احترام کرنا ہوگا۔ سارے مکانات نے اس تجویز کو متفقہ طور پر قبول کرلیا اور کالونی کے شرائط وضوابط پر عمل پیرا ہونے کا عہد کیا۔

مجھے اس کالونی میں مکڑی کے جالے صاف کرنے کے کام پر مامور کردیا گیا ہے۔ ان مکانات کے تعلق سے ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان میں مکڑی کے جالے تیزی سے پھیلتے رہتے ہیں اور اگر ایک دو دن جالے صاف نہ کئے جائیں تو ساری کالونی بڑے بڑے خوفناک مکڑی کے جالوں میں تبدیل ہوجائے گی۔

مکان نمبر ۲۷۳/۲۱ کا مکیں جو ایک بڑے کارخانے کا مالک ہے ایک خطرناک سازش کا شکار ہے۔ کارخانہ کا ایک مزدور جو مکان نمبر ۵۱۵/۲۱ میں رہائش پذیر ہے کسی طرح اس کارخانے کا مالک بن بیٹھنے کے منصوبے بنارہا تھا۔ دوسرے مزدور بھی اس سازش میں اس کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں اندرونی تیاریاں جاری ہیں ایک اور مزدور جو مکان نمبر ۴۶۶/۲۱ کا مالک ہے اور جو مالک کارخانہ کے خلاف سازش میں شریک ہے اس نے کچھ چالاک اور عیار قسم کے مزدوروں کو اپنی طرف کرلیا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ سازش کے کامیاب ہوتے ہی مکان نمبر ۵۱۵/۲۱ کے مالک کو جو اس سازش کا سرگروہ ہے کارخانہ کیساتھ غداری کے الزام میں قتل کرکے خود کارخانہ کا مالک بن بیٹھے۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ ان دونوں مزدوروں کے پیش

پشت مالکِ کارخانہ کے چچازاد بھائی کا ہاتھ ہے۔ وہ خود کو کارخانہ کا اصل حق دار سمجھتا ہے۔ دوسری طرف مالکِ کارخانہ ان سازشوں سے بے خبر نہیں ہے۔ لیکن اُن سے نمٹنے کے لئے کوئی کاروائی کرنا اس لئے مشکل ہے کہ وہ ایک دوسرے کارخانہ کے قیام کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

مکان نمبر ۴۱۱/۲۱ اور مکان نمبر ۴۱۲/۲۱ کو ایک چھوٹا سا کھلا میدان الگ کرتا ہے۔ دونوں مکان اُس کھلے میدان کو اپنے اپنے احاطہ میں شامل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مکان نمبر ۴۱۲/۲۱ نے راتوں رات اپنی دیوار میں ایک دروازہ بنالیا ہے۔ جس دن مکان نمبر ۴۱۱/۲۱ اپنا دروازہ کھلے میدان میں کھولے گا وہ بھی اپنا دروازہ اسی طرف کھول دے گا۔ مکان نمبر ۴۱۳/۲۱ جس کی عقبی دیوار میں پہلے ہی سے دروازہ بنا ہوا ہے اور جو کھلے میدان میں کھلتا ہے کالونی کے قیام سے پہلے ہی سے کھلے میدان پر اپنا حق جتا رہا تھا۔ اس مکان کا معمار کافی دُوراندیش واقع ہوا تھا۔ اسی نے مالک مکان کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے مکان کی عقبی دیوار میں ایک دروازہ بنا لے تاکہ آئندہ چل کر وہ کھلے میدان پر اپنے حق کا جواز پیش کر سکے۔

مکان نمبر ۴۱۳/۲۱ اسی دروازہ کی بنیاد پر کھلے میدان پر اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مکان نمبر ۴۱۴/۲۱ جو کھلے میدان سے صرف دو قدم پیچھے ہے آگے بڑھ کر کھلے میدان سے مل جانا چاہتا ہے تاکہ اُسے بھی کھلے میدان پر حق جتانے کی گنجائش رہے۔ اسے امید ہے کہ پورا میدان نہ سہی تھوڑا حصہ تو ضرور اس کے ہاتھ آجائے گا۔

مکان نمبر ۱۶۶/۲۱ کے مالک اور مکان نمبر ۳۳۳/۲۱ کی مالکن کے درمیان ناجائز جنسی تعلقات قائم ہیں۔ وہ اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں مکان نمبر ۱۶۶/۲۱ کے مالک کو اپنے

یہاں بلا لیتی ہے۔ مَیں نے دونوں کو کئی بار بیڈ روم میں عریاں حالت میں دیکھا ہے۔ مکان نمبر ۲۱/۱۶۶ کا مالک اُسے ورغلا رہا ہے کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لے لے۔ وہ اب تک کئی عورتوں کو اپنے شوہروں سے علیٰحدہ کر چکا ہے۔ وہ عورت کو پہلے اپنے دامِ عشق میں گرفتار کرتا ہے۔ اُسے اپنے شوہر سے جُدا کر کے اس کے ساتھ عیش کرتا ہے اور پھر اُسے تنہا چھوڑ کر کسی دوسری عورت کو اپنے عشق کا شکار بنا لیتا ہے۔ اُسے یقین ہے کہ وہ مکان نمبر ۲۱/۳۳۳ کی مالکن کو اپنے شوہر سے جُدا کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن اُدھر مکان نمبر ۲۱/۳۳۳ کی مالکن اس سوچ میں ہے کہ وہ کس طرح مکان نمبر ۲۱/۱۶۶ کے مالک کو اپنی بیوی سے علیٰحدہ کر دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بازی میں مکان نمبر ۲۱/۳۳۳ کی مالکن کی ہی جیت ہوگی۔

مکان نمبر ۲۱/۱۸۱ کے بند کمرے میں یہ منصوبہ تیار کیا

جا رہا ہے کہ مکان نمبر ۲۱/۱۱۱ کے دونوں مالکان کے درمیان کس طرح بدگمانیاں پیدا کی جائیں۔ ۲۱/۱۱۱ کالونی کا سب سے پُرسکون اور آسودہ حال مکان ہے۔ وہ دونوں مالکان میں اختلاف پیدا کر کے اُن کے مکان کو انتشار اور افراتفری کی دلدل میں دھکیل دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس کام کے لئے چھوٹے مالک کے ایک قریبی دوست کو جو مکان نمبر ۲۱/۱۱۲ کا مالک ہے آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں۔ مکان نمبر ۲۱/۲۱۲ اس کام کے لئے بخوشی تیار ہو گیا ہے کہ اس کے دل میں ابتدا ہی سے اپنے دوست کے تئیں حسد اور تعصب کے جذبات کارفرما تھے اور اس مکان کی خوشحالی اُسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اور وہ اس خاندان کو درہم برہم ہوتے

دیکھنے کا متمنی تھا۔ اس کے مکان نمبر ۲۱/۱۱۱ کے ساتھ بے تکلف روابط تھے۔ اس بات کے پیش نظر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں مالکان کے بیچ شک وشبہات کے تخم بونے میں کامیاب ہوجائے گا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دونوں مالکان کے تعلقات تمام تر بدگمانیوں اور شک و شبہات سے بالاتر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کے امن و سکون کو حاصل کر سکے تھے اور اپنے مکان کو آسودگی اور خوشحالی سے ہمکنار کیا تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود اس بات کا قوی امکان ہے کہ مکان نمبر ۲۱/۱۱۱ مکان نمبر ۲۱/۱۱۲ کی شاطرانہ چالوں کا شکار ہوجائے گا۔ وہ دونوں مالکان کی فطری کمزوریوں کو سامنے رکھ کر مکان نمبر ۲۱/۱۸۱ کے بند کمرے میں منصوبے بنا رہے ہیں۔

مکان نمبر ۲۱/۹۸۱ کالونی کا سب سے ترقی یافتہ مکان ہے اور یہاں کے سارے مکانات کو اپنی ملکیت میں شامل کرنے کا خواہشمند ہے۔ مکان نمبر ۲۱/۱۸۹ جو کالونی کا دوسرا ترقی یافتہ مکان ہے وہ مکان نمبر ۲۱/۹۸۱ کی ذہنیت سے بخوبی واقف ہے اور وہ بھی کالونی میں اپنا سکہ جمانے کی پرزور کوششوں میں مصروف ہے۔ دونوں مکان ایکدوسرے کی نیت کو اچھی طرح جان گئے ہیں۔ اور وہ ایکدوسرے پر سبقت لے جانے کے لئے اندرونی طور پر اپنی پوری قوت اور سرمایہ صرف کر رہے ہیں۔ ان دونوں مکانات کی کاروائیوں سے مکان نمبر ۲۱/۸۹۹ بھی چوکنا ہوگیا ہے اور وہ بھی آہستہ آہستہ کالونی میں اپنا اثر ورسوخ بڑھانے کی تگ و دو کر رہا ہے۔ اپنی اس کوشش میں اسے ایک حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے۔ اس مکان کی کوششوں سے مکان نمبر ۲۱/۹۸۱ اور مکان نمبر

۱۸۹/۲۱ خوف زدہ ہوگئے ہیں کہ کہیں وہ انکے اثرات کو کم نہ کر دے۔ ان حالات میں مکان نمبر ۲۹۴/۲۱ اور مکان نمبر ۲۱۵/۲۱ کو احساس ہوگیا کہ اب انہیں بھی خاموش بیٹھے نہیں رہنا چاہیئے۔ انہیں بھی کالونی پر اپنا رعب جمانے کی ضرورت ہے۔ وہ بھی اس دَوڑ میں شریک ہوگئے اور بہت کم مدّت میں کالونی کے مکانات کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ اس طرح ہر مکان حسبِ بساط کالونی پر اپنا تسلط قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

مکانات کی موجودہ صورتِ حال اُن کے کالونی کی صورت اختیار کرنے سے پہلے کی صورتِ حال سے کسی طرح مختلف نہیں ہے بلکہ اور بھی افسوسناک کہی جاسکتی ہے۔ ایک دن مَیں نے اس بات پر سنجیدگی سے غور کیا کہ کالونی کے مکانات میں مکڑی کے جالے اتنی تیزی سے کیوں کر پھیل جاتے ہیں۔ کافی سوچ اور فکر کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہر مکان میں بے شمار بڑی بڑی مکڑیاں چھپی بیٹھی ہیں جو تیزی سے چھتوں، دیواروں اور روشن دانوں میں جالے بُن دیتی ہیں اور اگر ان مکڑیوں کو ختم کر دیا جائے تو جالوں کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوگا۔ مَیں نے مالکانِ مکانات پر یہ بات اشارتاً ظاہر بھی کی تھی۔

لیکن وہ مجھ پر بُری طرح بگڑ گئے تھے اور مجھے خبردار کیا تھا کہ اگر انہوں نے کالونی میں ایک بھی مری ہوئی مکڑی دیکھی تو وہ مجھے کالونی سے نکال باہر کر دیں گے۔ اس دن سے میرا جالے صاف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مَیں پہلے دیواروں، چھتوں اور روشن دانوں میں تنے ہوئے جالوں کو آہستہ سے چھیڑتا ہوں جس سے جالوں میں چھپی بیٹھی بڑی بڑی مکڑیاں باہر نکل کر اِدھر اُدھر چھپ جاتی ہیں۔ پھر مَیں بہت احتیاط سے جالے صاف کر کے چلا جاتا ہوں۔ دوسرے، ی

لمحے مکڑیاں تیزی سے جالے بُن کر اُن میں چھپ جاتی ہیں اور
کیڑے مکوڑوں کا شکار کرنے لگتی ہیں۔

تِکون

ہماری دادی کے مطابق جس گھر میں ہم سکونت پذیر ہیں وہ گھر ہمارے ابّا کا نہیں ہے بلکہ اس کے شوہر یعنی ہمارے دادا کی ملکیت ہے۔ ابّا کو یہ گھر ورثے میں ملا تھا۔ دادا کو زمین کا ایک ٹکڑا اُن کے باپ یعنی ہمارے پردادا کی طرف سے ملا تھا جس پر دادا نے مٹّی کی دیواروں اور کھپریل کی چھت کا ایک معمولی سا گھر بنایا تھا۔ دادا کے گزر جانے کے بعد ابّا نے اُسے توڑ کر اینٹوں کی دیواریں اور سمنٹ کی چھت بنوائی اور کچے

آنگن کو گچ سے بھر کر ہموار کیا۔
اس میں شک نہیں کہ ہمارا موجودہ گھر ماضی کی بہ نسبت کہیں بہتر ہے۔ لیکن کیا گھر کی پہچان صرف اُس کے ظاہری خدوخال سے ہوتی ہے یا پھر اُس کا تعلق گھر کی داخلی کیفیات سے بھی ہے؟

اگر گھر کی پہچان کا دارومدار اُس کے ظاہری خدو خال پر ہے تو واقعی یہ ہمارے گنجان آباد بڑے بڑے شہر اور اونچی اونچی کثیر المنزلہ عمارتیں ہماری ترقی و خوشحالی کی علامت ہیں۔ اور اگر گھر کی پہچان کا تعلق اس کی داخلی کیفیات سے بھی ہے تو پھر ہمیں یقیناً ایک صدمہ سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ہمارا گھر امن و سکون سے یکسر محروم تھا۔ ہر روز ایک نیا ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور ہر رات ایک نئی قیامت ٹوٹ پڑتی تھی۔ گھر فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ چیخ و پکار اور شور و غل سے بام و دَر دہلنے لگتے تھے۔ عجیب بھگدڑ سی مچی رہتی تھی اور ایک کہرام سا بپا رہتا تھا۔ ایک تماشہ ہوتا تھا گھر میں اور محلے کے لوگ گھر کی دہلیز پر آکر جمع ہوجاتے تھے اور گھر کے افراد کو طنز اور مذاق کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ایک اذیت ناک اور اہانت آمیز صورتِ حال پیدا ہوجاتی تھی۔

دادی کی اپنی الگ حکمت عملی تھی۔ دادی اپنے پُرنور چہرے، گوری رنگت اور روشن آنکھوں کی وجہ سے کوئی برگزیدہ بڑھیا معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اپنے عادات و اطوار سے وہ ایسی نہیں تھی۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری اس کی اپنی بیٹیاں اور ان کے بچے تھے۔ وہ رہتی تو ہمارے گھر میں تھی لیکن اسے فکر لگی رہتی تھی اپنی بیٹیوں اور اُن کے بچوں کی۔ اس کا خیال تھا کہ ہمارے گھر پر نہ صرف اس کا حق ہے بلکہ اس کی بیٹیاں اور

اُن کی اولاد بھی اپنا حق رکھتی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ ابا کی آمدنی کا کم سے کم آدھا حصہ کسی نہ کسی طرح اُن تک پہنچ جائے۔ اور جب بھی موقع ہاتھ آتا وہ گھر کی کوئی نہ کوئی چیز اپنی سفید چادر میں چھپا کے اُن کے ہاں پہنچا آتی تھی۔ گھر میں روزمرہ کی استعمال کی اشیاء دن کے اُجالے میں منظروں کے سامنے ہی ایسے گُم ہو جاتی تھیں جیسے اُنہیں کسی جادُو کے زور سے غائب کر دیا گیا ہو۔

اماں ان باتوں سے بے خبر نہیں تھی۔ لیکن وہ کبھی اُن کا ذکر ابا سے نہیں کرتی تھی۔ اماں نہایت فراخ دِل اور رَواداری واقع ہوئی تھی اور اس کی کشادہ دلی کا تو سارے محلہ میں چرچا تھا۔ کبھی میری بڑی بہنیں ابا سے دادی کی شکایت کرنا چاہتیں تو اماں انہیں خاموش کر دیتی تھی۔ اماں کیساتھ سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ہمیشہ دوسروں کی کمزوریوں اور خطاؤں کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش میں خود مشکلات کا شکار ہو جاتی تھی۔

دادی کے تعلقات میری دونوں بڑی بہنوں سے ہمیشہ کشیدہ رہتے اور دادی کو ان دونوں سے بڑا خوف لاحق تھا جو اس کی حرکتوں پر نگاہ رکھتی تھیں۔ ان کے درمیان لعن طعن بھی ہوتی اور دادی اُن کے حق میں بددُعائیں بھی کیا کرتی کہ انکی شادیاں نہ ہو۔ وہ عین جوانی میں بیوہ ہو جائیں۔ وہ اولاد کی خوشیوں سے محروم رہیں۔ اور جواباً بہنیں بھی اُسے کوسا کریں کہ اُس کے ہاتھ پاؤں کو لقوہ مارے۔ وہ چارپائی پر پڑی گو اور موت میں لیٹی رہے۔ اُس کے جنازے کو کاندھا دینے والے میسر نہ آئیں۔ دادی انتقام لینے میں ماہر تھی اور اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا تھا۔ موقع دیکھ کر وہ ابا سے بہنوں کی چغلی کھاتی کہ وہ دونوں ہر وقت آئینے کے رُوبرو کھڑی اپنی زلفیں سنوارتیں اور چہروں پر غازہ ملتی رہتی ہیں۔ وہ بہنوں کو ابا کی ڈانٹ پلانے سے نہیں چوکتی تھی میرے

اور بڑے بھائی کے خلاف بھی وہ ابا کے ذہن و دل میں زہر بھرا کرتی تھی۔

ابا مزاجاً بہت سخت گیر تھے۔ اور معمولی معمولی بات پر گرفت کرتے اور چھوٹی چھوٹی غلطی پر اتنی کڑی سزا دیتے کہ آدمی کو اپنے وجود سے نفرت ہونے لگتی۔

دادی کو ہماری آسودہ حالی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ ہمارا کنبہ ان معنوں میں آسودہ حال تھا کہ ہمیں اچھی خوراک میسر تھی۔ صاف ستھرے کپڑے پہننے کو ملتے تھے اور ہم اپنے ذاتی گھر میں بائش پذیر تھے۔ اس کی بیٹیاں اور اُن کے بچے ان بنیادی ضرورتوں سے محروم تھے۔ اور اسی لئے اماں کو اپنی نندوں اور اُن کے بچوں سے ہمدردی تھی۔ اماں بے حد حساس تھی اور اس کے سینے میں دردمندی کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اور اُدھر دادی، اماں کے ان جذبات سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتی تھی۔ اور اکثر ماں کو اپنے ان ہمدردانہ جذبات واحساسات کے صلے میں ابا کے غیض وغضب کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ اور دادی بڑی ہوشیاری سے ابا کے ہر عتاب اور قہر سے صاف اپنا دامن بچا لیتی تھی اور ساری مشکلیں اور بلائیں اماں کے سر نازل ہوجاتی تھیں۔ دُوسرے الفاظ میں اماں کی زیادہ تر مشکلات اس کی اپنی خود ساختہ تھیں۔

بارش کی آمد آمد تھی۔ اماں نے جھینگروں سے محفوظ کپڑے میں لپیٹ کر الماری میں رکھی ہوئی تین چھتریاں نکالیں اور انہیں جھاڑ پھونک کر دالان میں ایک کھونٹی سے لٹکا دیا تاکہ انہیں بارش میں استعمال کیا جا سکے۔ چھتریوں کو کھونٹی سے ٹنگائے ابھی ایک آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اُن میں سے ایک چھتری غائب ہوگئی۔ اماں نے سارا گھر چھان مارا چھتری کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ رات ہی موسلا دھار بارش شروع ہوگئی تھی۔ صبح ابا ایک چھتری لے کر دفتر چلے گئے۔ بڑا بھائی دوسری چھتری

ہیں کالج چلا گیا۔ اب میرے پاس اسکول جانے کے لئے
چھتری نہیں تھی۔ مجبوراً میں نے اماں کے کہنے پر بارش میں اسکول نہ
جانے کا ارادہ کرلیا۔ لیکن جب بارش قدرے تھمی تو میں اپنے سر
پر کتابیں رکھے اسکول کے لئے نکل پڑا۔ میری شامت دیکھئے کہ
راستہ میں مجھے زوردار بارش نے آگھیرا اور میں کتابوں سمیت سر
سے پاؤں تک پوری طرح پانی میں تر بتر ہوگیا۔ بڑی مشکل سے
میں اسکول پہنچا۔ اور جب اسکول سے گھر آیا تو سخت بخار میں
مبتلا ہوگیا۔ بخار سے میرا بدن تپنے لگا تھا۔ اماں نے دو دو کمبل
اُڑھا کر مجھے سلا دیا۔ لیکن میں کمبل کے اندر بھی کانپ رہا تھا۔
دادی نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ کر تک میری حالت نہیں دیکھی۔
وہ تو اُلٹا مجھے ڈانٹ رہی تھی کہ مجھے بارش میں اسکول جانے کی
ضرورت کیا تھی۔ میں پڑھ لکھ کر کونسا بڑا آدمی بننے والا ہوں۔
پڑھائی سے بہتر ہے کہ کسی کام دھندے پر لگ جاؤں۔ ایک
تو میں بخار کی شدت سے تڑپ رہا تھا اور دوسرے دادی مجھے
ذہنی اذیت پہنچا رہی تھی۔

ابا گھر آئے تو مجھے بخار میں دیکھ کر اُن کا پارہ چڑھ گیا۔
اگر گھر میں کوئی بات روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر ہو جاتی تو
اُن کی طبیعت میں چڑچڑاہٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ بالخصوص گھر
میں کوئی بیمار پڑتا تو وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہو جاتے تھے۔ اُن کے
خیال میں بیماریاں خود بخود نہیں آتی ہیں بلکہ انہیں بلایا جاتا ہے۔
اس پر مستزاد یہ کہ وہ بخار، زکام، کھانسی، سردرد، اور دست
وغیرہ کو بیماریوں میں شمار کرتے ہی نہیں تھے۔ اور ان بیماریوں کے
علاج کے لئے ڈاکٹروں کے پاس جانا سراسر بے وقوفی تصور کرتے
تھے۔ جب ابا کو معلوم ہوا کہ میں بارش میں بھیگنے کی وجہ سے
بیمار ہوا ہوں تو وہ اور بھی غصہ ہوگئے۔

"گھر میں چھاتا ہوتے ہوئے تم بارش میں بھیگتے

ہونے اسکول کیوں گئے۔ ہے؟" ابا نے میرا کان سختی سے مروڑ دیا اور میں درد کی شدت سے تلملا اُٹھا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

چھاتے کا نام سنتے ہی دادی نے اپنی پشت ہماری طرف کرلی جیسے وہ اس سارے واقعہ سے لاتعلق ہو بلکہ وہ تو یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ گھر کے کسی بھی معاملہ میں اس کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ آج گھر کی حالت اِس درجہ خراب اور بگڑی ہوئی ہے۔

میں کمبل میں منہ چھپائے بلک بلک کر رونے لگا۔ مجھے روتے دیکھ کر میری چھوٹی بہن بھی اماں کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی۔ بڑی بہنیں میرے پاس ہی کھڑی تھیں۔ بڑا بھائی اکثر ایسے موقعوں پر گھر سے باہر نکل جاتا تھا۔ وہ روز روز کے فتنہ وفساد سے تنگ آچکا تھا اور اس کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی۔

ابا کو ذرا ذرا سی بات کریدنے کی عادت تھی۔ اور انہیں اس بات کا پتہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ گھر سے ایک چھتری غائب ہوگئی ہے۔ انہوں نے اماں کو ایک توہین آمیز گالی دی اور اُسے فاحشات کی صف میں لاکھڑا کردیا۔ ابا نہایت بدزبان واقع ہوئے تھے۔ ان کا لہجہ اتنا تلخ اور ترش تھا کہ آدمی کے دل ودماغ کو چھیدتا ہوا اُسے اندر تک لہولہان کردیتا تھا۔ اتنی شرمناک اور ننگی گالیاں بکتے تھے کہ جنھیں سن کر حاملہ عورت کا حمل گرجائے اور نابالغ دوشیزہ جگہ پر بالغ ہوجائے۔ وہ اپنی ماں، بیوی اور بیٹیوں کو تک نہیں بخشتے تھے۔ اور انہیں اتنا سخت دشنست سناتے کہ انہیں اپنے عورت ہونے پر شرم آتی تھی۔

امّاں چیختی چلاتی رہی۔ ابّا کی بدزبانی پر احتجاج کرتی رہی لیکن ابّا اُس کی برابر تذلیل کئے جا رہے تھے۔ ابّا ہر معاملہ میں امّاں کو ہی موردِ الزام ٹھہراتے تھے۔ اُن کے خیال میں امّاں کی بے توجہی اور غفلت نے گھر کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ وہ امّاں کو گھر گرہستی کے قابل ہی نہیں سمجھتے تھے۔ امّاں کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی لیکن اپنی بے عزتی اور ہتک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ پکوان خانہ سے دو چار ہانڈیاں اُٹھا لائی اور ابّا کے سر پر دے ماریں گھر میں ایک شور بلند ہوا۔ دادی یہ سوچ کر خوف محسوس کر رہی تھی کہ کہیں جھگڑے کا رُخ اُس کی طرف نہ ہو جائے۔ بالآخر محلہ والوں کی مداخلت سے فساد کی آگ ٹھنڈی ہوئی۔

ابّا کے اپنے تعصبات اور ترجیحات تھیں۔ کچھ لوگوں پر وہ اندھا دھند بھروسہ کرتے تھے اور کچھ لوگ قابلِ اعتماد ہوتے ہوئے بھی اُن کی نگاہوں میں مشکوک تھے۔ جن لوگوں پر انہیں بے تحاشا اعتماد تھا اُن میں کرانے کی دوکان والا بھی شامل تھا۔ اُن کے اعتماد کی انتہا یہ تھی کہ اگر وہ شکر کی جگہ مٹی، چاول کی جگہ کنکر اور تیل کی جگہ پانی بھی دے دیتا تو اُسے بے چوں چرا قبول کر لیتے تھے۔ درحقیقت بات یہ تھی کہ کرانے کی دوکان میں ابّا کا اُدھار کھاتا چلتا تھا اور ماہانہ سودا سلف مل جاتا تھا۔ ظاہر ہے ادھار خریدا ہوا سامان نقد خریدے ہوئے سامان سے تو بہتر نہیں ہو سکتا۔ اور پھر دوکان دار کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنا سڑا گلا مال گاہکوں کے سر مونڈھ دے۔ اور ادھار خریدنے والے گاہکوں کے ساتھ زیادہ تر ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوکان دار اپنی مرضی کے مطابق سامان ہمارے گھر بھیج دیتا اور سامان دیکھ کر ماں اپنا سر پکڑ کر رہ جاتی۔ لہسن و ادرک صاف کیا جاتا

تو گھٹ کر آدھے رہ جاتے۔ دالوں اور چاولوں سے کنکر چنے جاتے تو اُن کی مقدار بھی کافی کم ہو جاتی۔ دوسری چیزوں کا بھی یہی حال تھا۔ مثل ہے کہ اُدھار کھانا پھوس تاپنا برابر ہے۔ گھریلو معاملات میں بیوی کی رائے بھی اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن ابا، اماں کو بے وقوف اور کم عقل گردانتے تھے اور اس کی باتوں کو ہوا میں اُڑا دیتے تھے۔ نتیجتاً اماں غم کھا کر رہ جاتی تھی۔

لکڑی فروش کا شمار بھی اُن لوگوں میں تھا جن پر ابا اندھا دھند اعتماد کرتے تھے۔ یہاں بھی لکڑیاں اُدھار ملتی تھیں۔ لکڑی فروش نے تو اماں کی ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ کچی اور گیلی لکڑیاں ہمارے گھر بھیج دیتا تھا۔ چولہا جلانے کی کوشش میں سارا پکوان خانہ کثیف دھوئیں سے بھر جاتا اور دھوئیں کے سبب کھانستے کھانستے اماں کا دم نکلنے لگتا تھا۔ اماں گیلی لکڑیوں کی شکایت کرتی تو ابا کہتے کہ اُسے چولہا جلانے کا سلیقہ نہیں ہے۔ جس عورت کے بال پکوان خانے میں سفید ہو گئے ہوں۔ جس کی آنکھوں کی بینائی پکوان خانہ میں جاتی رہی ہو۔ جس کے جسم کا سارا خون پکوان خانے میں جل گیا ہو۔ کیا اُسے چولہا جلانے تک کا سلیقہ نہیں ؟ کھانوں کے متعلق بھی ابا کی یہی رائے تھی انہیں پڑوسن کی دال پسند تھی لیکن اپنی بیوی کا مرغ مسلم پسند نہیں تھا۔ کبھی کبھی ابا، اماں کے ساتھ پکوان میں شامل ہو جاتے تھے اور اماں کو پکوان کے عجیب و غریب طریقے بتاتے اور ہدایتیں دیتے جاتے۔ اور جب اماں ان کی حرکتوں سے تنگ آجاتی تو جلتا ہوا چمچہ اُنکے منہ میں ٹھونس دیتی اور ابا ایک شریر بچے کی طرح پکوان خانے سے بھاگ نکلتے۔

موسم سرما کی ٹھٹھری ہوئی صبح تھی۔ علی الصباح میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں نے دیکھا اماں حسب معمول پکوان خانہ

میں مصروف تھی۔ میں آگ سینکنے کے لئے بستر سے اُٹھ کر اماں کے پاس آگیا وہ ابا کے لئے پانی گرم کر رہی تھی۔ پکوان خانہ گھرے دُھویں سے بھرا ہوا تھا۔ اماں پھونکنی سے چولہا جلانے کی کوشش میں بُری طرح کھانسے جا رہی تھی۔ میں اپنے ہاتھ پیر سمیٹ کر چولہے کے سامنے اماں کی گود میں آ بیٹھا۔ اور اماں نے مجھے دھویں سے بچانے کے لئے میرے چہرے کو اپنے پلو میں چھپا لیا۔

„بیٹا یہاں دھویں میں کیوں آئے ہو۔ کچھ دیر اور سو لیتے"۔۔۔۔ اماں نے میرے سر کا بوسہ لیا۔

مجھے اماں کی گود میں بیٹھ کر عجیب سی خوشی اور تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ میں اماں کی گود میں ایسے جا بیٹھتا تھا جیسے مرغی کے چوزے آسمان پر اڑتی چیل کو دیکھ کر خوف کے مارے مرغی کے پروں میں جا چھپتے ہیں۔ جیسے بلّی کے بچّے احساسِ تنہائی سے میاؤں میاؤں کرتے ہوئے بلّی کی ٹانگوں سے لپٹ لپٹ جاتے ہیں۔ مجھے اماں کی نرم و گداز گود میں یک گونہ سکون کا احساس ہوتا تھا۔

اماں پھونکنی سے چولہا جلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھونکتے پھونکتے اس کا گلا پھول گیا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو کر ان میں پانی بھر آیا تھا اور چہرہ لال لال ہو گیا تھا۔ لکڑیاں تھیں کہ جلتی ہی نہیں تھیں اور ان سے کثیف دُھواں برابر نکلتا جا رہا تھا۔

ابا بستر سے اُٹھ کر دانت مانجھتے ہوئے سیدھے اماں کی طرف چلے آئے۔

„کیوں، پانی گرم ہو گیا؟"۔۔۔۔ ابا نے کسی قدر عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اماں سے پوچھا۔

"منھ اندھیرے سے پانی گرم کر رہی ہوں۔ جیسے بھی گرم ہوا ہو نہا لیجئے۔"۔۔۔۔ اماں نے ساڑی کے پلّو سے اپنی آنکھوں کا پانی پونچھتے ہوئے قدرے تلخی سے جواب دیا۔

ابّا نے پانی کے ہانڈے میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پانی ابھی گرم نہیں ہوا تھا۔ غصہ سے ابّا نے پہلے تو اماں کے ایک شرمناک گالی دی اور پھر اُسکے منھ پر تھوک دیا۔

اماں جو صبح سویرے سے چولہے میں گیلی لکڑیوں کے ساتھ خود کو بھی جلا رہی تھی ایکدم سناٹے میں آگئی۔ سچ تو یہ ہے کہ اماں اپنے شوہر اور بچوں کے لئے اپنے وجود کا کوئی نہ کوئی حصّہ قربان کرتی رہی ہے۔ لیکن ابّا نے کبھی اماں کی قدر نہیں کی۔ اُسے عزّت و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اس کے جذبات و احساسات کا احترام نہیں کیا۔ اور آج اُس کے منھ پر تھوک دیا تھا۔ ابّا کے اس ذلت آمیز رویّہ پر اماں کی

آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ بڑی بہنیں بھاگتی ہوئی آئیں۔ اماں کو روتے دیکھ کر وہ بھی رونے لگیں۔ میں بھی رونے لگا۔ چھوٹی بہن بھی رونے لگی۔ بڑا بھائی اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا اور وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ گھر میں جیسے صفِ ماتم بچھ گئی ہو۔ اماں کے دل میں نہ جانے کیا آگیا تھا۔ اُس نے مجھے گود سے اُتارا۔ چولہے سے ایک ادھ جلی کولتی اٹھائی اور ابّا کی طرف لپکی۔ بڑی بہنیں اماں کو روکنے میں ناکام رہیں۔ اماں نے ابّا کے سر پر دُھواں اُٹھتی ہوئی کولتی دے ماری اور ابّا چکرا کر وہیں بیٹھ گئے۔ اچھّا ہوا کہ ابّا کے سر پر کوئی گہرا زخم نہیں آیا اور نہ ہی خون بہا۔ سر پر جس جگہ چوٹ لگی تھی وہاں گہری سوجن آگئی تھی۔ شاید اماں کو ابّا کے سر پر کولتی مارتے ہوئے اس بات کا احساس

تھا کہ وہ اپنے شوہر کے سر پر ضرب لگا رہی ہے۔ ورنہ اس ضرب سے تو ابا کا سر دو نیم ہو جاتا۔ اماں فطرتاً نرم خو اور سادہ لوح تھی۔ لیکن اگر کوئی اس کی انا کو زخمی کرتا، اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتا، اس کی سادہ لوحی کا استحصال کرتا تو وہ ایک مختلف عورت ثابت ہوتی۔ اماں کا اپنا مزاج اور اپنی خاندانی روایات تھیں۔

دادی خاموشی سے یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اس میں کچھ کہنے یا دخل اندازی کی جرأت نہیں تھی۔ وہ نہ ابا کی طرف داری کرکے اماں کی دشمنی کا خطرہ مول سکتی تھی۔ اور نہ اماں کی حمایت کرکے ابا کی مخالفت کا سامنا کرسکتی تھی۔ اسے تو ان دونوں سے اپنا مطلب پورا کرنا تھا۔ وہ کبھی کبھی اخلاقاً ابا اور اماں کو ڈانٹ بھی دیتی تھی لیکن اس کی کون سنتا۔ گھر میں اُس کی کیا اہمیت رہ گئی تھی۔

ابا بڑے تحمل کے ساتھ اس واقعہ کو برداشت کرگئے۔ ایسا ہی ہوتا تھا۔ جب بھی اماں طیش میں آجاتی تھی ابا مفاہمت پر اُتر آتے تھے۔ ابا جلدی جلدی تیار ہوکر دفتر چلے گئے۔ دن بھر گھر پر قبرستان کی سی خاموشی اور خوف مسلط رہا۔

رات ابا گھر آئے تو ہمارے لئے بہت ساری مٹھائی بھی لے آئے۔ وہ اماں کو اسی طرح خوش کرتے تھے۔ اماں جتنا جلد غصہ ہوجاتی تھی اتنا جلد ٹھنڈی بھی ہوجاتی تھی۔ اور اماں کی اس کمزوری سے ابا اچھی طرح سے واقف تھے۔ اماں نے ہمیں نیند سے جگا کر اپنے ہاتھوں سے مٹھائی کھلائی۔ ہم دن بھر کچھ بھی نہیں کھائے تھے۔ اور بھوکے ہی سو گئے تھے۔ جب بھی ابا کا اماں سے جھگڑا ہوتا اور سچ تو یہ ہے کہ روز ہی کسی

نہ کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہوتا تھا، ابا رات کو بچوں کے لئے مٹھائی ضرور لاتے تھے۔ اماں کو اپنے بچوں سے

بے انتہا محبت تھی۔ وہ اس طرح بچوں کو خوش کر کے اماں کو بھی خوش کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ دراصل ابا نہیں چاہتے تھے کہ اماں ان سے ناراض یا خفا رہے اور اُن کی کوئی بات بے کار چلی جائے۔

گھر کے امن و سکون اور تہذیب کو تباہ و برباد کرنے میں دادی، ابا اور اماں تینوں ہی ذمہ دار تھے۔ کوئی اپنی عیاری اور خود غرضی سے اُسے نقصان پہنچا رہا تھا۔ کوئی اپنی وحشت اور انتہا پسندی سے فتنہ و فساد برپا کر رہا تھا۔ اور کوئی اپنی فطری کوتاہیوں سے پریشانیاں پیدا کر رہا تھا۔

دادی کی موت کے بعد گھر کے ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ ابا کے انتقال کے بعد حالات یکسر بدل جاتے ہیں۔ اور اماں چل بسی تو فضا میں تغیر آتا ہے۔

دادی، ابا اور اماں کے باہمی تصادم اور فتنہ و فساد سے گھر پر جو گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے وہ آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

بڑے بھائی پر پاگل پن کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ وہ نہ تو اپنی تعلیم مکمل کر سکا ہے اور نہ ہی کوئی ملازمت اختیار کر سکا ہے۔ ازدواجی زندگی سے کوسوں دُور بھاگتا ہے۔ اور ابتک غیر شادی شدہ ہے۔

بڑی بہنوں کی شادیاں ہو گئیں اور وہ تین تین چار چار بچوں کی ماں بھی بن گئی ہیں۔ لیکن دوسری بہن نہ معلوم کیوں راتوں میں نیند کی حالت میں چونک کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور اُسے نیند میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اُس کے بچوں کا گلا گھونٹ کر انہیں مار رہا ہے۔

میں برسرِ روزگار ہوں اور شادی شدہ بھی لیکن

میں نے اپنے تمام قرابت داروں، محلہ والوں اور دوست احباب سے اپنے تعلقات مکمل طور پر منقطع کر لئے ہیں۔ نہ میں اپنے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت دیتا ہوں اور نہ ہی میری بیوی اور بچے کسی کے گھر آتے جاتے ہیں۔

چھوٹی بہن ابھی زیرِ تعلیم ہے اور فی الحال حصولِ تعلیم ہی اس کا اہم مقصد ہے۔ اُسے گھر گرہستی میں ابھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

○

پہلی کتاب

سکول میں شائستہ کا پہلا دن تھا اور جب وہ کلاس
میں داخل ہوئی تو میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ ایک میں
ہی نہیں، سارے اسٹوڈینٹس اس کی طرف متوجہ ہو گئے
تھے۔ جب اُس نے اپنی نشست پر بیٹھ کر زیرِ لب مسکراتے ہوئے
سارے کلاس پر سرسری نگاہ ڈالی تو کلاس میں جیسے جان سی
آگئی تھی اور ہمارے تناؤ کے شکار چہروں پر شگفتگی اور تازگی
کی لہر سی دوڑ گئی تھی۔ پڑھائی کے دوران ٹیچر بھی نظر اُٹھا کر

اس کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ بلا کی جاذبیت اور دلکشی تھی اس کے چہرے میں۔ اس کی آمد نے ہماری کلاس کو چار چاند لگا دیئے تھے۔
ہمارے اسکول میں شائستہ جیسی خوبصورت، نفاست پسند اور مہذب طالبہ کا داخلہ یقیناً ایک خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتا تھا۔
اگر میں ہمارے اسکول کو کسی کھنڈر سے تشبیہہ دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ اسکول کی عمارت کسی زمانے میں عالیشان رہی ہوگی۔ لیکن اب جگہ جگہ سے اس کا پلستر اکھڑ چکا تھا۔ اور دیواروں سے جھانکتی ہوئی ٹوٹی اینٹیں خود اپنی زبانی اپنی خستہ حالی کا نوحہ پڑھ رہی تھیں۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ اور سلاخیں زنگ آلود ہو چکی تھیں۔ عقبی دیوار میں شگاف نمودار ہو گیا تھا۔ بوسیدہ چھت کی شکستہ شہتیروں کو دیمک چاٹ رہی تھی۔ پرانی کرسیوں اور میزوں کے کمزور پائے ڈھیلے ہو کر ہلنے لگے تھے۔ اسکول کے وسط میں موجود باغیچے پر خزاں کا دور دورہ تھا۔ اور ہر طرف خشک پتے اور مردہ ٹہنیاں بکھری پڑی تھیں۔ نہ فرش پر سبزہ تھا اور نہ پژمردہ پودوں پر پھول اور غنچے۔ سوکھی گھاس پر اِدھر اُدھر چوہے اور کیڑے مکوڑے دوڑتے اچھلتے دکھائی دیتے تھے۔ اسکول کے بام و در پر عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی اور اس کے گوشے گوشے سے چمگادڑوں کی بیٹ کی بدبو کا احساس ہوتا تھا۔
شائستہ اسکول کی تمام لڑکیوں سے ممتاز نظر آتی تھی۔ اور اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے مختلف و منفرد۔ نکلتا ہوا قد۔ گداز بدن۔ شفاف گندمی رنگت۔ ستواں ناک۔ روشن آنکھیں۔ بھرے بھرے ہونٹ۔ گفتار میں شیرینی اور رفتار میں ایک خاص ادا۔ یہ بات نہیں کہ اسکول میں خوبصورت اور باصلاحیت لڑکیوں کا کال تھا۔ لیکن بات یہ تھی کہ اُن کے وجود اور عدم وجود میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا تھا۔ اُن کی

موجودگی کا قطعی احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے ڈیسکوں پر اس طرح سمٹی سمٹائی بیٹھی رہتیں کہ مشکل سے دکھائی دیتی تھیں۔ انہیں اپنے لباس کا ہوش تھا اور نہ اپنے چہروں اور گیسوؤں کی خبر۔ اس کا سبب خود اسکول کا غیر دلچسپ اور حوصلہ شکن ماحول تھا۔ جہاں اسٹوڈینٹ کے فطری جذبات واحساسات کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور اُسے ذہنی ونفسیاتی دباؤ کے زیر اثر رکھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسٹوڈینٹ کی شخصیت مکمل طور پر ابھر کر سامنے نہیں آتی تھی بلکہ نامکمل رہ جاتی تھی اور بعض اوقات تو منفی رُخ اختیار کر لیتی تھی۔

اِن باتوں کی طرف نہ تو اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے توجہ دینے کی زحمت کی تھی اور نہ ٹیچروں نے اُن پر غور وخوص کیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ریٹائر ہو گئے ہیں۔ جسمانی وذہنی دونوں اعتبار سے تھکے ہارے نظر آتے تھے۔ اور اُدھر ٹیچروں کی باہمی چپقلش اور سیاست نے انہیں اسکول کی جانب توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں دی تھی۔

ریاضی کے ٹیچر کو اپنے مضمون سے زیادہ انگلش میں دلچسپی تھی اور وہ کلاس میں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے تھے کہ انہیں انگلش پر بھی عبور حاصل ہے اور وہ انگلش ٹیچر سے بہتر انگلش پڑھانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ دوسری طرف انگلش ٹیچر کو اس بات کا دعویٰ تھا کہ انہیں انگلش گرامر پر سند حاصل ہے۔ سائنس ٹیچر احساسِ برتری میں مبتلا تھے اور وہ سوشیل ٹیچر کو کم تر نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جب کہ سوشیل ٹیچر کو اس بات کا فخر حاصل تھا کہ وہ سب سے سینئر ٹیچر ہیں۔ اور آئندہ ہیڈ ماسٹر کے عہدے کے لئے انہیں کا نام سرفہرست ہوگا۔ بعض ٹیچروں کے خیال میں ڈرائنگ ٹیچر اور کرافٹ ٹیچر مفت

کی روٹیاں توڑ رہے تھے۔ ہندی ٹیچر اور دیگر علاقائی زبانوں کے ٹیچروں کے درمیان باہمی سمجھ بوجھ کا فقدان تھا۔ نتیجتاً اسکول روز بروز زوال کی طرف رواں دواں تھا۔

میں شائستہ کی جانب شدت کے ساتھ متوجہ ہو گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسکول کی پڑھائی سے بیزار اور بدظن تھا اور مجھے شائستہ کے خوبصورت اور دلکش وجود میں جائے پناہ مل گئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے بچپن ہی سے کتابوں کے نام سے کوفت سی ہوتی تھی اور میں انہیں ہاتھ لگاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مجھے اسکول کا ماحول بھی دلچسپ اور حوصلہ افزا نہیں ملا تھا۔

میں بچپن میں جب مدرسہ میں پڑھتا تھا وہ اسکول کے نام پر ایک بوسیدہ سا مکان تھا جس میں تین چھوٹے بڑے کمرے تھے اور مختصر سا آنگن۔ اندرونی کمرے میں پہلی اور دوسری جماعتوں کے بچوں کو ایک ساتھ بٹھایا جاتا تھا۔ اس کے بغل والے کمرے میں تیسری اور چوتھی کے طلبا، وطالبات کی مشترکہ جماعتوں کو باری باری سے پڑھایا جاتا تھا اور بیرونی کمرے میں پانچویں جماعت کے طالب علموں کی کلاسس لی جاتی تھیں۔

آنگن کو ہم کھیل کے میدان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ دراصل یہ چھوٹا سا آنگن کسی کھیل کے قابل نہیں تھا۔ یہاں کرکٹ اور فٹ بال تو کجا گلی ڈنڈا تک کھیلنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہم بعض اوٹ پٹانگ کھیلوں میں اپنا وقت گزارتے تھے اور ان اوٹ پٹانگ کھیلوں کے دوران ہم سے بیہودہ

حرکتیں بھی سرزد ہو جاتی تھیں۔ ہم لڑتے جھگڑتے تھے۔ ایکدوسرے کا گریبان پھاڑتے تھے۔ ایکدوسرے کے سر پر ضربیں لگاتے تھے۔ ایکدوسرے کی ٹانگیں کھینچتے تھے۔ کوئی کھیل بھرپور انداز میں کھیلنے کی خواہش دل ہی میں رہ جاتی تھی۔

بچوں کی یہی عمر ہوتی ہے پھلنے پھولنے کی۔ اُن کے معصوم اور ملائم ذہنوں کی نشو و نما کا یہی وقت ہوتا ہے اور اُن کی بے لوث اور سادہ شخصیت کی تشکیل کی یہی منزلیں ہوتی ہیں۔ اور جب اُنہیں کشادہ ماحول اور خاطر خواہ آب و ہوا میسر نہیں آتی ہے تو وہ کسی خودرَو پودے کی طرح ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ ہماری صورت حال بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

مدرسہ چھوٹا اور بچوں کی کثیر تعداد۔ کمروں میں بچوں کو ٹھونس ٹھونس کر بٹھایا جاتا تھا اور ہمیں شرارتیں کرنے اور شور شرابا برپا کرنے کا موقع ہاتھ آجاتا تھا۔ ہم ایکدوسرے کو نوچتے کھسوٹتے تھے۔ ایک دوسرے کی کتابیں اور کاپیاں پھاڑتے تھے۔ ایکدوسرے کے کپڑوں اور چہروں کو سیاہی سے رنگتے تھے۔ مدرسہ میں پڑھائی کم ہوتی تھی اور مستیاں زیادہ۔ اتنے سارے بچوں کے لئے صرف تین ٹیچر تھے۔ ٹیچروں کے رویے اور عمل سے ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں سنجیدہ ہیں اور انہیں بچوں میں دلچسپی ہے۔

شائستہ کی جانب متوجہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں انفرادیت پسند تھا اور ہر اس شے کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا جو کسی انفرادی پہلو کی حامل ہوتی تھی۔ شائستہ بھی اپنے ساتھ نئی تہذیب، نئی روایت اور نئے آداب لائی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جہاں شرم و حیا تھی وہاں بے باکی بھی تھی۔ وہ اپنے وجود سے جتنی بے نیاز تھی اتنی ہی باخبر بھی تھی۔ اس کے چہرے

پر جس قدر سنجیدگی تھی اس سے زیادہ مسکراہٹ بھی تھی۔ وہ ایکطرف اصول پرست تھی تو دوسری طرف اصول شکن بھی تھی۔ جہاں کم آمیز تھی وہاں بے تکلف بھی تھی۔ شائستہ کو دیکھ کر مجھے بیحد سکون اور استقرار حاصل ہوتا تھا۔

میرے اندر ایک نمایاں تبدیلی یہ واقع ہوئی تھی کہ اب میں بلاناغہ اسکول جانے لگا تھا۔ جب کہ شائستہ کی آمد سے پہلے میں ہفتے میں دو ایک روز اسکول سے غیر حاضر ضرور رہتا تھا۔ اس کے برعکس اب میں اسکول کی جانب کھنچا چلا جارہا تھا۔ شائستہ کا حسین چہرہ میری آنکھوں اور دل میں نقش ہوگیا تھا اور اسے دیکھنے کے لئے میں بیقرار رہتا تھا۔

اکثر اسٹوڈینٹس کلاس کی اگلی صفوں میں بیٹھ کر خود کو ذہین اور سچے طالب علم ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں بھی کبھی کبھار اپنی جھوٹی ذہانت اور ظاہری دلچسپی کا مظاہرہ کرنے کے لئے پہلی نشستوں میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس موقع پر مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ میں چوتھی جماعت میں تھا۔ ماسٹر صاحب نے بلیک بورڈ پر کچھ مختصر سے سوال لکھے اور بچوں کو ان کے جواب لکھنے کی ہدایت کرکے اپنی کرسی پر آبیٹھے اور ساتھ میں تاکید بھی کی کہ ہم کسی طرح کا شور شرابا نہ کریں اور جوابات لکھ کر اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھے رہیں۔

ہم بلیک بورڈ پر سوالات دیکھ دیکھ کر اپنی کاپیوں میں انکے جوابات لکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد میری نظر ماسٹر صاحب کی طرف اٹھ گئی۔ میں اگلی صف میں بیٹھا ہوا تھا اور اپنی کاپی میں سوالوں کے جواب لکھتے لکھتے چپکے سے نظر اٹھا کر ماسٹر صاحب کی طرف دیکھ لیا تھا۔ ماسٹر صاحب

اپنی کرسی پر دنیا و مافیہا سے بے خبر سوئے ہوئے تھے اور وقفے وقفے سے ان کے حلق سے خراٹوں کی آواز نکل رہی تھی۔

یہ دیکھکر میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور آکر ماسٹر صاحب کو جگانے لگا۔

"ماسٹر صاحب! ماسٹر صاحب!"

کلاس کے سارے بچے خوف و حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میرے جگانے پر ماسٹر صاحب چونک کر نیند سے ایسے اُٹھ بیٹھے جیسے انسپیکشن کو آئے ہوئے کسی افسر نے انہیں کلاس میں اپنی کرسی پر سوتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ گہری نیند کی وجہ سے اُن کی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے اُبھر آئے تھے۔ ماسٹر صاحب نے کھا جانے والے انداز سے مجھے دیکھا اور اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے شدید غصّہ کے عالم میں مجھ سے پوچھا۔

"کیا تم نے جوابات لکھ دیئے۔؟"

"جی ہاں، جی نہیں!"۔ مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"دکھاؤ اپنی کاپی!"۔ ماسٹر صاحب نے اپنی آنکھیں جو گہری نیند کے اچانک ٹوٹ جانے سے انگارے اُگل رہی تھیں، مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔

میں نے جلدی سے کاپی لاکر ماسٹر صاحب کے آگے بڑھا دی۔ خوف کے مارے میرے دُبلے پتلے ہاتھ پاؤں بُری طرح لرز رہے تھے اور میرے چھوٹے سے دل کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہو گئی تھیں کہ میں انکی آواز اپنے کانوں میں سُن رہا تھا۔

ماسٹر صاحب نے میرے ہاتھ سے کاپی چھین کر میز پر رکھدی۔ انہوں نے یہ تک نہیں دیکھا کہ میں نے کیا لکھا ہے اور کیا نہیں لکھا۔ میز سے ڈنڈا اٹھایا اور مجھے اتنا مارا کہ میرے ہاتھ پاؤں اور پیٹھ پر سُرخ و سیاہ نشانات نمودار ہو گئے تھے۔

وہ دن مجھے آج تک نہیں بھولا ہے اور میں نے

اُس دن سے کبھی کلاس کی اوّل صف میں بیٹھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔

اب مَیں پھر سے کلاس کی اگلی نشستوں میں بیٹھنے لگا تھا۔ میری اس تبدیلی پر شاید ٹیچر یہ سمجھ رہے تھے کہ پڑھائی میں میری دلچسپی بڑھ رہی ہے اور مَیں پڑھائی پر پوری توجہ دے رہا ہوں۔ جب کہ حقیقت دوسری تھی۔ مَیں کلاس کی اوّل صف میں اس لئے بیٹھنے لگا تھا کہ یہاں سے مَیں شائستہ کو صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ میرا دل چاہتا کہ اسکول کی آخری گھنٹی کبھی نہ بجے اور مَیں یُوں ہی شائستہ کو پلک جھپکے بغیر دیکھتا رہوں اور شائستہ میرے رُوبرو بیٹھی رہے۔

جب کبھی شائستہ اسکول نہیں آتی تو مَیں اضطراری کیفیت میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ اُس کی غیر موجودگی میں مجھے کلاس نامکمل، غیر دلچسپ اور بے معنی سا معلوم ہوتا تھا۔ اور مَیں بے قرار نگاہوں سے کلاس کے درودیوار کو ایسے تکنے لگتا تھا جیسے میری کوئی اہم اور قیمتی شے کھو گئی ہو اور مجھے اس کی سخت تلاش ہو۔ چھٹی کے دنوں میں میری حالت مزید دِگرگوں ہو جاتی تھی۔ مَیں چاہتا کہ اسکول بلاناغہ چلتا رہے اور کسی روز بھی بند نہ ہو اور یہاں تک کہ ہفتے کے آخری دن بھی تعطیل نہ ہو تاکہ مَیں شائستہ کے دیدار سے کسی لمحہ محروم نہ رہوں۔ ایک وقت تھا کہ مَیں اسکول کے ہمیشہ کے لئے بند ہو جانے کی تمنا کیا کرتا تھا کہ مَیں اسکول کی قید، کتابوں کے بوجھ اور ٹیچروں کے جبر سے رہائی حاصل کر سکوں۔ اور اب مجھے اسکول کا ایک گھنٹہ کیلئے بھی بند ہونا گوارا نہیں تھا۔ اسکول کے ساتھ میرا دلی رشتہ قائم ہو گیا تھا اور اسکول میری دلچسپی کا مرکز بن گیا تھا۔

میری ڈرائنگ بہت اچھی تھی اور مَیں اس سلسلہ میں سائنس ٹیچر کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ سائنس ٹیچر ڈرائنگ میں کمزور

تھے اور وہ مینڈک کی جگہ مچھلی اور مچھلی کی جگہ سانپ بنا دیتے تھے۔ اس لئے مَیں بلیک بورڈ پر مطلوبہ جانوروں اور پودوں کی شکلیں بنا دیا کرتا تھا۔ تصویریں بناتے وقت مَیں گوشۂ چشم سے شائستہ کو دیکھ لیا کرتا تھا اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ مَیں بلیک بورڈ پر شائستہ کی قدِ آدم تصویر بنا کر اس کے سامنے اکیلا بیٹھ کر اُسے ایک دلچسپ کتاب کی طرح پورے انہماک اور مکمل یکسوئی کیساتھ پڑھتا رہوں۔ وقت کے ساتھ ساتھ شائستہ کے حسن وشباب میں نکھار آتا جا رہا تھا۔ روشن آنکھوں کی چمک میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ رسیلے ہونٹوں میں قطرہ بہ قطرہ شہد بھر رہا تھا اور گلابی رخساروں کی سُرخی گہری ہوتی جا رہی تھی۔

مَیں چاہتا کہ سارا کلاس اسٹوڈینٹس سے خالی ہو اور مَیں اکیلا کلاس میں بیٹھا رہوں اور شائستہ ٹیچر کی جگہ مجھے پیار سے پڑھائے۔ کتابوں میں میری دلچسپی بڑھائے۔ میرے سوالات کا بڑی سادگی سے جواب دے اور خود مجھ سے سوالات کر کے میری ذہانت کو بیدار کرے اور میرے صحیح جوابات پر میری حوصلہ افزائی کرے اور مجھے شاباشی دے۔ وہ میرے ساتھ محبّت اور شفقت سے پیش آئے۔ نہ مجھے ڈانٹے اور نہ میری پٹائی کرے۔ کلاس میں کسی قسم کی شرمندگی یا ندامت کا احساس پیدا نہ ہو۔ اور کبھی شائستہ کلاس میں اکیلی ہو اور مَیں اُسے محبّت سے پڑھاؤں۔ انتہائی دوستانہ اور خوشگوار ماحول میں کلاس چلتا رہے۔

میرا اور شائستہ کا اسکول میں آخری سال تھا۔ پچھلے تین چار سال کے عرصے میں ہم دونوں ایکدوسرے کے قریب ضرور آئے تھے۔ لیکن اب بھی ہمارے درمیان ایک فاصلہ موجود تھا اور اس فاصلے کا سبب مَیں خود تھا۔ کبھی مَیں تکلفات سے

کام لے رہا تھا۔ کبھی لاتعلقی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ کہیں میں تذبذب کا شکار تھا، کہیں پیش و پس میں مبتلا تھا۔ کبھی کوئی تشویش لاحق تھی۔ کبھی کوئی اندیشہ دامن گیر تھا۔ اسکے باوجود ہم دونوں غیر محسوس طور پر ایکدوسرے سے وابستہ تھے اور شائستہ کو بھی اس وابستگی کا علم تھا۔

کالج میں ہم دونوں نے ایک ساتھ داخلہ لیا تھا۔ اب ہم دونوں کے جذبات و احساسات کی نوعیت یکسر بدل گئی تھی۔ اور ہم ایکدوسرے کے وجود کو پہلے سے زیادہ شدت کیساتھ محسوس کر رہے تھے۔ شائستہ کو اس بات کا احساس تھا کہ میں اپنے دل میں اس کی خاطر ایک خاص گوشہ رکھتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں ابتک شائستہ کے بے پناہ حسن سے لطف اندوز ہوتا رہا تھا اور کبھی اس کی نگاہوں کا مطلب سمجھنے یا اس کے خوبصورت چہرے کے تاثرات کے مفاہیم تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اب میں شائستہ کے حسین چہرے کو پڑھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اس کے گلابی رخساروں کی سرخی، روشن آنکھوں کی چمک اور طرز گویائی سے اسکے باطن میں پوشیدہ جذبات و احساسات کو سمجھنے لگا تھا۔ شائستہ کا خوبصورت چہرہ ایک دلچسپ اور معنی خیز کتاب تھا جسے میں حرف بہ حرف پڑھنے، جملہ بہ جملہ سمجھنے اور صفحہ بہ صفحہ سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شائستہ کا چہرہ وہ واحد کتاب تھا جس نے میرے اندر پڑھائی کا شوق اور مطالعہ کا ذوق پیدا کیا تھا۔ شائستہ کا چہرہ دلچسپ اسلوب میں لکھی ہوئی نہایت سادہ لیکن بامعنی کتاب تھا جو پڑھنے والے کے ذہن و دل کو تازگی و توانائی بخشتا تھا۔

کالج کا زمانہ نہایت سرعت سے گزر رہا تھا۔ یہاں

کی تعلیم کی رفتار بہت تیز تھی اور میں اس معاملہ میں پہلے ہی سے سُست رَو واقع ہوا تھا اور اپنے ہم جماعت اسٹوڈنٹس کی دَوڑ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ ایک ریٹ دَوڑ تھی جس میں تمام اسٹوڈنٹس شریک تھے۔ کالج میں علم کو مختلف شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہم کو یہ بتلایا گیا تھا کہ علم کی کونسی شاخ ہمیں کس پیشے تک لے جاتی ہے۔ یہیں سے ہمارے اندر پیشہ ورانہ ذہنیت پرورش پاتی ہے اور ہمارا مزاج کاروباری انداز اختیار کر لیتا ہے۔ ہم علم کو پیشہ ورانہ مقاصد اور کاروباری اغراض کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہمارے پیشِ نگاہ حصولِ علم کا یہی واحد مقصد تھا۔ جب کہ میرا مزاج اور ذہنیت اپنے ہم جماعت اسٹوڈنٹس سے بالکل مختلف تھی۔ میرے نزدیک حصولِ علم کا مقصد شعور و آگہی کی منزلوں تک رسائی حاصل کرنا تھا۔

مجھے اس بات کی بے انتہا خوشی تھی کہ شائستہ نے میرے ذہن و دل میں شعور و آگہی کی شمع روشن کر دی تھی اور میں اس کا حسین چہرہ پڑھتے پڑھتے وقت، حالات، دنیا اور خود اپنا چہرہ پڑھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

○

بازیافت

اُسے مجھ سے شدید نفرت ہوگئی تھی اور اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ مجھے زندہ دفن کر دیتا۔ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ میرا ہو پی جاتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ کیوں کہ میں اُس کا لختِ جگر تھا۔ آنکھوں کا نُور اور دل کا قرار تھا۔

ماں کہتی ہے کہ وہ میری پیدائش پر فرطِ مسرت سے جھوم جھوم اُٹھا تھا۔ شدتِ جذبات سے اس کا چہرہ کھل اُٹھا تھا اور احساسِ فخر سے اس کا سینہ پھیلتا چلا گیا تھا۔

مجھ سے اُسے بے انتہا محبت تھی۔ وہ میرے گالوں، ناک، ٹھوڑی اور پیشانی کو چوما کرتا۔ مجھے اپنے ہاتھوں میں لیکر جھولا جھلاتا۔ گھوڑا بن کر مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھا لیتا اور اپنے کندھوں پر اُٹھا کر بندر کی طرح اُچھلتا کودتا تھا۔ مجھے ہنستا دیکھ کر وہ قہقہے لگاتا تھا اور میرے ذرا سا رونے سے وہ مضطرب سا ہو جاتا تھا۔ مَیں بیمار پڑتا تو اُس کی پریشانی دیدنی ہوتی۔ اور ماں سے کبھی میری دیکھ بھال میں چوک ہو جاتی تو وہ غصہ ہو جاتا بلکہ اُسے ڈانٹ بھی دیتا تھا۔ جب کہ ماں مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ شاذو نادر ہی کبھی ایسا ہوتا کہ اس سے غفلت ہو جاتی۔ وہ میرے معاملہ میں کسی کوتاہی یا تساہل کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اُسے میری صحت و تندرستی کا بے حد خیال تھا۔ مجھے ہر روز نیم گرم پانی سے نہلایا جاتا۔ چہرے، ہاتھ پاؤں اور سارے بدن پر خوشبودار پوڈر ملا جاتا۔ اچھے اچھے رنگ برنگی کپڑے پہنائے جاتے اور گال پر کاجل کا ہلکا سا نشان بھی لگایا جاتا کہ مجھے کسی کی نظرِ بد نہ لگ جائے۔ وقت وقت پر ماں مجھے اپنا دُودھ پلاتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ مَیں کافی فربہ ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ پیر گورے گورے اور سڈول ہو گئے تھے۔ اور گال سیب کی طرح سُرخ!

مجھے محلّے والے بھی بہت پیار کرتے تھے۔ خصوصاً جوان غیر شادی شدہ لڑکیاں مجھے اپنی گود سے نیچے نہیں اُتارتی تھیں اور انہیں مجھے اپنی کمر پر اُٹھائے رکھنے کا بڑا ارمان تھا۔ اور وہ بیاہی عورتیں جنہیں شادی کے کئی سال بعد بھی ماں بننا نصیب نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنی چھاتی سے لگائے رکھتیں۔ شاید اس اُمید سے کہ اُن کے ہاں بھی مجھ جیسا بچہ پیدا ہو۔

بچپن میں کتنا پیار ملتا ہے۔ بے لوث و بے غرض پیار!!

میں اپنے ننھے ننھے پیروں پر کھڑا ہو کر چھوٹے چھوٹے ڈگ بھرنے لگا تو اس کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مجھے چلتا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک در آئی تھی جیسے میں نے کرۂ ارض کا فاصلہ چشم زدن میں طے کر لیا ہو۔ اس مرحلہ پر اس نے میرے ہاتھ میں اپنی انگلی تھما دی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کی انگلی پکڑ کر چلنے کا عادی ہو جاؤں۔ یہ بات درست ہے کہ جو عادتیں بچپن میں جڑ پکڑتی ہیں وہ آخری عمر تک ساتھ نہیں چھوڑتیں۔ اور اس کا منشا بھی یہی تھا کہ میں آخر تک اس سے وابستہ رہوں۔ جیسے میرا وجود اس کے وجود کے بغیر بے معنی ہو۔ لیکن مجھے تو اپنے وجود کی معنویت خود تلاش کرنی ہے۔ اس کے امکانات کو خود دریافت کرنا ہے۔ اس کے اوصاف کو خود پہچاننا ہے۔ بلاشبہ میں اس کے وجود کا حصہ ہوں اور میری رگوں میں اس کا لہو محوِ گردش ہے۔ لیکن میں اپنا ایک آزاد وجود رکھتا ہوں اور اپنی ایک منفرد ذات۔

میرے ابھی کھیلنے کودنے کے دن تھے اور میرے چہرے سے ابھی بچپن کی معصومیت بھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ غیر محسوس طور پر میری ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دینے لگا تھا۔ وہ مجھ سے اپنے تجربات بیان کرتا۔ اپنے واقعات و حادثات کا ذکر کرتا۔ اپنے مسائل و مشکلات پر روشنی ڈالتا۔ اس کی باتوں کا مخصوص لب و لہجہ تھا اور ان میں ایک خاص معنویت پوشیدہ تھی۔ وہ اپنی باتوں کو مختلف زاویوں سے سمجھاتا۔ لیکن اس کی باتیں ایک ہی محور پر آ کر رکتیں۔ ایک محدود محور جس کے ارد گرد ساری آبادی مصروف عمل تھی۔

مجھے اس کے تجربات و مشاہدات کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں تھا۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس نے اپنے تجربات و حادثات سے جو سبق سیکھا ہو میں بھی اس سبق کو دہراؤں یا اس

سے وہی نتائج اخذ کروں جو اُس نے اخذ کئے تھے۔ ہر تجربہ ایک مدت کے بعد اپنی وقعت کھو بیٹھتا ہے اور ہر حادثہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اثرات سے محروم ہو جاتا ہے۔ ان واقعات و مشاہدات کی روشنی میں مَیں اپنے لئے کوئی لائحہ عمل ترتیب دُوں یہ بات میرے لئے قابلِ قبول نہیں تھی۔ وہ بچپن ہی میں میرے گلے میں مقاصد کا طوق ڈال کر مجھے فرائض کی زنجیروں میں جکڑ کر اخلاقیات کے زنداں میں اسیر کر دینا چاہتا تھا۔ اس کا یہ عمل میرے نزدیک ایک جبر تھا۔ خاندانی جبر جس کا یہاں ہر فرد شکار ہے اور اس جبر نے فرد کو شخصی آزادی سے محروم کر کے اس پر اجتماعی قہر مسلط کر دیا ہے۔

ان ہی دنوں میری اپنی شخصیت تشکیل پا رہی تھی۔ میرے اپنے خیالات نمو پذیر تھے۔ میری اپنی فکر بیدار ہو رہی تھی۔ اپنے ارد گرد کو مَیں اپنے طور پر سمجھنے کی مساعی کر رہا تھا۔ چیزوں اور شخصیتوں کے متعلق میری اپنی رائے قائم ہو رہی تھی۔

مَیں جیسے جیسے سنِ بلوغت کو پہنچ رہا تھا اس کی پریشانی اور اضطراب قابلِ دید تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اس کی ہدایتوں پر عمل درآمد شروع کر دوں۔ اس کی خواہشوں اور آرزوں کو عملی جامہ پہنا دوں۔ اس کی باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لوں۔ وہ ایک ہی سانس میں مجھے سب کچھ سمجھا دینا چاہتا تھا تاکہ مَیں مکمل طور پر اُس کے حلقۂ اثر میں آجاؤں۔ اُٹھتے بیٹھتے وہ میرے سر پر سوار رہتا تھا۔ میری حرکتوں پر اُس کی کڑی نظر رہتی تھی اور میرے اعمال کا وہ سختی سے احتساب کرتا تھا۔ میرے اطراف اس کی نصیحتوں اور ہدایتوں کا حصار تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اور میری فطری نشو و نما کی بہت کم گنجائش باقی رہ گئی تھی۔

"ہاں بیٹا! میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور اس خواب کے مطابق تمہیں اس پہاڑ کی چوٹی پر ذبح کرنا ہے۔ چلو، میرے ساتھ چلو"

میں نے دیکھا کہ پہاڑی پر اِدھر اُدھر ہزاروں لاکھوں انسانی سر بکھرے پڑے ہوئے تھے جن سے تازہ خون رِس رہا تھا۔ باپ اپنے بیٹوں کو اس پہاڑی پر لاتے اور انہیں ذبح کر کے اُن کی لاشوں کو اُٹھائے اپنے اپنے گھروں کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ ذبح کرنے کا یہ عمل صدہا سال سے رائج ہے اور اس کا یہ اقدام میرے لئے غیر متوقع نہیں تھا۔ مجھے پہلے ہی اس بات کا علم تھا۔ اور اس کے مقاصد اور ارادے ابتدا ہی سے اس جانب اشارہ کر رہے تھے۔ اب حالات ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ چکے تھے۔ مجھے یا تو اُس کے آگے گردن جُھکا دینا تھا یا اس کے خلاف بغاوت کا اعلان کرنا تھا۔ اس کے آگے سر جھکا دینا میری انا کا مسئلہ تھا۔ اور جہاں تک بغاوت کی بات ہے تو یہ چیز میری فطرت میں شامل تھی۔ وہ مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چُھڑا کر فیصلہ کن لہجے میں اُس سے کہا ———

"مجھے ذبح نہیں ہونا ہے"

اُسے مکمل یقین تھا کہ میں بلا تامل اُس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دوں گا کیونکہ ہماری روایت بھی یہی ہے اور ہم روایت شکنی کے مرتکب ہونے کی جسارت نہیں رکھتے ہیں۔ روایتوں کے تقدس اور احترام کے خلاف کوئی قدم اُٹھانے کی ہم میں جرأت ہی کہاں ہے۔

اُسے میرے منفی جواب کی توقع نہیں تھی۔ وہ غیض و غضب میں آگیا اور اس کے چہرے پر نفرت اور حقارت رقص کرنے لگی۔

میں گھر چلا آیا۔ سوٹ کیس میں اپنے کپڑے اور کتابیں ڈال کر چلنے لگا تو ماں نے مجھے اپنی چھاتی سے لگا کر اپنے آنسوؤں کی دہائی دی۔ بہنوں نے بہت منایا۔ بھائیوں نے بہت سمجھایا۔ ماں کی محبت، بہنوں کی الفت اور بھائیوں کی چاہت کے باوجود یہ گھر میرے لئے ایک زنداں بن گیا تھا۔ جہاں میرے دست و پا کے ساتھ میرے دل و دماغ کو بھی قید کر دیا گیا تھا۔ یہاں میری انا کو پائمال کیا جا رہا تھا۔ میرے جذبات و احساسات کا خون کیا جا رہا تھا۔ میری تمناؤں اور آرزوؤں کو روندا جا رہا تھا۔ میں نے تمام رشتوں اور تعلقات کو بالائے طاق رکھ کر گھر سے راہِ فرار اختیار کی۔

گھر سے نکل کر میں دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ شہر در شہر بھٹکتا رہا۔ پہلے ہی میرے حوصلے اور عزائم شکستگی سے دوچار تھے۔ مایوسی اور ناامیدی نے میری توانائیوں اور قوت کو کمزور کر دیا تھا۔ گہرے صدمات نے میرے جذبات و احساسات کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور اب میں تنِ تنہا ایک جمِ غفیر کے حصار میں تھا۔ میں بہت جلد نامساعد حالات کا شکار ہو گیا۔ اور سخت حالات کے تھپیڑوں نے میرا چہرہ مسخ کر ڈالا۔ میری خود اعتمادی کو پارہ پارہ کر ڈالا اور میرے وجود کے چیتھڑے بکھیر ڈالے۔ میں ایک زندہ لاش تھا۔ جسے اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے مارا مارا پھرتا رہا۔

ادھر میرے گھر سے چلے جانے کے بعد وہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ میری جدائی کے شدید غم اور صدمے نے اُسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا۔ اور جب وہ بسترِ مرگ پر تھا تو میں آخری دیدار کے لئے اسکے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ پیر اور سارا جسم مردہ تھا۔ صرف آنکھوں میں جان باقی تھی۔ اس نے مجھے آنکھ بھر کر دیکھا

اور پھر اسی لمحے اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں۔

اس کی تجہیز و تکفین کے بعد جنازے میں شریکِ اہلِ محلہ اور عزیز و اقارب نے مجھ سے اظہارِ تعزیت کیا۔ لیکن میرا مسئلہ اس کی موت نہیں تھی بلکہ میرے اپنے وجود کی بازیافت تھی۔ مجھے اپنے منتشر وجود کو ریزہ ریزہ جمع کرنا تھا۔ اپنی شکستہ ذات کو نئے سرے سے تعمیر کرنا تھا۔ اپنے مفلوج ذہن کو نئی توانائی اور قوت سے بیدار کرنا تھا اور اپنے پژمردہ دل کو تازگی عطا کرنی تھی۔ اور بازیافت کا یہ عمل اتنا آسان نہیں تھا۔ یہ عمل اتنا ہی دشوار گزار اور پیچیدہ تھا جتنا رحمِ مادر میں ایک بچے کی تخلیق اور پھر اس کی تولید۔

یہ بچہ جس سرزمین پر جنم لے وہ سرزمین کشادہ فضاؤں سے معمور ہو اور ہر جبر و استبداد سے مبرا۔!